مرتبہ

میرزا محمد بشیر ایم، اے، بی، ٹی

"لو اب کہانی سنو میری سرگزشت میری زبانی سنو"

غالب

(اُردوئے معلیٰ۔ صفحہ ۱۵۴)

مرتّبہ

میرزا محمد بشیر ایم۔ اے۔ بی۔ ٹی
لکچرار ایم۔ ایس۔ جے کالج
بھرتپور

جانِ غالبؔ تابِ گفتارِ گماں داری ہنوز
سخت بیدردی کہ می پُرسی زما احوالِ ما

زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالبؔ
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

فہرست مضامین

جناب ڈاکٹر عبد الحق صاحب سکریٹری انجمن ترقی اردو (ہند) کی رائے

"میں نے آپ کی کتاب دیکھی۔ آپ نے بے شک بہت محنت کی ہے اور ترتیب بھی اس کی بہت اچھی ہے .... آپ کی محنت قابل قدر ہے۔ اس سے قبل جو دو کتابیں اس مضمون پر لکھی گئی ہیں آپ کی تالیف اُن سے بہتر ہے"

عبد الحق

بنجارہ روڈ

حیدرآباد دکن
۶ر نومبر ۱۹۳۲ء

دیباچہ

سچ پوچھئے تو جس پر جو گزرتی ہے وہ خود ہی اس کو خوب بیان کرتا ہے نواب اسداللہ خاں غالبؔ کی زندگی اور پھر اُس کا بیان خود اُن کی زبانی اُس میں جس قدر بھی دلآویزی ہو کم ہے۔ یہ درست ہے کہ مرزا غالب نے اپنی داستانِ زندگی کسی کتاب کی صورت میں خود نہیں لکھی لیکن اہل ادب واقف ہیں کہ انکی زندگی کے حالات ان کے خطوط سے بخوبی آشکار ہیں۔ "سرگزشت غالب" میں اُردوئے معلیٰ، پنج آہنگ، دستنبو و عود ہندی سے ایسی تمام عبارتیں انتخاب کر کے ایک جا کی گئی ہیں کہ جن سے ان کی زندگی کا مکمل انکشاف ہوتا ہے۔

غالبؔ کی زندگی دراصل ایک تصویر ہے ان گوناگوں حالتوں کی جن کا مظاہرہ ہم آئے دن کیا کرتے ہیں۔ کبھی غم و الم کی طغیانی، کبھی بے پایاں مسرت کبھی بادہ نوشی، کبھی فاقہ مستی، کبھی "زنگارنگ بزم آرائیاں" اور کبھی آہ وزاریاں لیکن اس ساری تصویر میں کچھ ایسی رعنائیاں ہیں کہ ہماری آنکھیں محو دید ہیں۔ اور بقول محمد جان قدسیؔ ؎

در بزمِ وصال تو بہ ہنگام تماشا نظارہ ز جنبیدن مژگاں گلہ دارد

سرگزشت غالبؔ سے مرزا صاحب کے صرف عاداتِ و خصائل ہی نہیں معلوم ہوتے بلکہ ملک کی سیاسی، معاشرتی و اقتصادی حالت کا بہت کچھ پتہ چلتا ہے۔

اُس خدائے سخن کا حقیقت نگار قلم اپنے ادبی وتمدنی ماحول کی سچی ترجمانی کرتا ہے۔

اس (خودنوشتہ) سوانح عمری میں بعض ایسی عبارتیں جن میں دوسروں سے تخاطب ہے اوران کا نام باربار آیا ہے نظر انداز کرنی پڑیں۔ بعض خطوط میں تاریخ درج نہ تھی اور دوسرے خطوں سے بھی یہ نہ پتہ چلا کہ وہ کب لکھے گئے اس سبب سے بعض واقعات سے دست کش ہونا پڑا۔ چند دلچسپ مقولے جو اُردو خطوط میں منتشر تھے چُن کر ایک جگہ جمع کیے گئے ہیں۔

میں نے یہ کتاب "سرگزشت غالب" ۱۹۳۱ء میں مرتب کی تھی۔ اس کا مسودہ بتاریخ ۲۸ اگست ۳۱ء لکھنؤ میں مکمل ہوا تھا۔ اسی زمانے میں جناب (ڈاکٹر) عبدالحق صاحب، سکریٹری انجمن ترقی اُردو نے اس کو دیکھا اور میری حوصلہ افزائی فرمائی۔ میں جناب ڈاکٹر صاحب موصوف کا ممنون ہوں کہ انہوں نے چند کارآمد مشورے بھی دیئے۔ میں پروفیسر سید مسعود حسن صاحب رضوی ایم اے صدر شعبۂ فارسی واُردو، لکھنؤ یونیورسٹی کا بھی شکر گزار ہوں کہ انھوں نے بھی بعض مفید باتیں بتلائیں۔ حیرت ہوتی ہے کہ باوجود ایسے کرم فرماؤں کی ہمت افزائی کے یہ کتاب اب تک شائع نہ ہوسکی۔ لیکن نہیں۔ اس میں کچھ میری ہی کوتاہی وغفلت کو دخل ہے اور ع

اس میں شائبۂ خوبیٔ تقدیر بھی تھا

اس دس برس کے عرصے میں مرزا غالب کے متعلق کئی کتابیں شائع ہوئیں لیکن جہاں تک مجھے علم ہے مرزا کی آپ بیتی خود اُن کے الفاظ میں (بغیر

کسی حاشیہ آرائی کے) اب تک کسی نے نہیں پیش کی۔

ناسپاسی ہوگی اگر اُن رسالوں اور کتابوں کا ذکر نہ کیا جائے جو ابھی حال میں شائع ہوئی ہیں اور جن کے اقتباسات سے اب ہم نے فائدہ اٹھایا ہے مثلاً "مکاتیب غالب" از امتیاز علی عرشی "نادر خطوط غالب" از رسا ہمدانی رسالہ "ہندوستانی" و رسالہ "اردو"۔ وہ کتابیں جن کے مطالعہ سے میں مستفید ہوا حسب ذیل ہیں :- یادگارِ غالب۔ مرزا غالب۔ غالب نامہ نکات غالب غالب کا روزنامچہ و ادبی خطوط غالب۔

ان قدیم و جدید کتابوں کی ورق گردانی کے بعد اس غیرفانی شاعر و نثرنگار کی داستانِ حیات خود اُس کی زبانی پیش کرتا ہوں ؎

درد دل لکھوں کب تک جاؤں انکو دکھلاؤں
انگلیاں فگار اپنی، خامہ خوں چکاں اپنا (غالب)

بھرتپور

میرزا محمد بشیر

پہلا باب

پیدائش | میں آٹھویں رجب ۱۲۱۲ھ[۱] میں پیدا ہوا ہوں[۲]۔

خاندانی حالات | میں قوم کا ترک سلجوقی ہوں۔ دادا میرا ماوراءالنہر سے شاہ عالم کے وقت میں ہندوستان میں آیا۔ سلطنت ضعیف ہوگئی تھی، صرف پچاس گھوڑے نقارہ نشان سے شاہ عالم کا نوکر ہوا۔ ایک پرگنہ سیر حاصل ذات کی تنخواہ میں پایا۔ بعد انتقال اس کے جو طوائف الملوکی کا ہنگامہ گرم تھا وہ علاقہ نہ رہا۔ باپ عبداللہ بیگ خاں بہادر لکھنؤ جاکر نواب آصف الدولہ کا نوکر رہا۔ بعد چند روز حیدرآباد جاکر نواب نظام علی خاں کا نوکر ہوا۔ تین سو سوار کی جمعیت سے ملازم رہا۔ کئی برس وہاں رہا۔ وہ نوکری ایک خانہ جنگی کے بکھیڑے میں جاتی رہی۔ والد نے گھبراکر الور کا قصد کیا۔ راؤ راجہ بختاور سنگھ کا نوکر ہوا۔ وہاں کسی لڑائی میں مارا گیا۔ نصراللہ خاں میرا حقیقی چچا مرہٹوں کی طرف سے اکبرآباد کا صوبہ دار تھا اس نے مجھے پالا۔ ۱۸۰۶ء میں جرنیل لیک صاحب کا عمل ہوا۔ صوبہ داری کمشنری ہوگئی اور صاحب کمشنر ایک انگریز مقرر ہوا۔ میرے چچا کو جرنیل لیک صاحب نے سواروں کی بھرتی کا حکم دیا۔ چار سو سواروں کا برگیڈیر ہوا۔ ایک ہزار ذات کا لاکھ ڈیڑھ لاکھ رسالہ برطرف ہوگیا۔

۱؎ اردوئے معلیٰ صفحہ ۳۲۵۔ ۲؎ ایضاً صفحہ ۳۴۳

ملک کے عوض نقدی مقرر ہو گئی وہ اب تک پاتا ہوں۔ پانچ برس کا تھا جو باپ مرگیا[1]۔ نو برس کا تھا کہ چچا مرگیا۔ اس کی جاگیر کے عوض میری اور میرے شرکا حقیقی کے واسطے شامل جاگیر نواب احمد بخش خاں دس ہزار روپیہ سال اس میں سے میری ذات کا حصہ ساڑھے سات سو روپیہ سال۔ میں نے سرکار انگریزی میں یہ غبن ظاہر کیا کہ کولبرک صاحب رزیڈنٹ دہلی اور اسٹرلنگ صاحب بہادر سکریٹری گورنمنٹ کلکتہ متفق ہوئے میرا حق دلانے پر۔ رزیڈنٹ معزول ہوئے۔ سکریٹری گورنمنٹ بمرگ ناگاہ مرگئے۔ بعد ایک زمانے کے بادشاہ دہلی نے پچاس روپیہ مہینہ مقرر کر دیا۔ ان کے ولیعہد نے چار سو روپیہ سال۔ ولیعہد تقرر کے دو برس بعد مر گئے۔ واجد علی شاہ بادشاہ اودھ کی سرکار سے بہ صلہ مدح گستری پانسو روپیہ سال مقرر ہوئے۔ وہ بھی دو برس سے زیادہ نہ جیے۔ یعنی اگرچہ اب تک جیتے ہیں مگر سلطنت جاتی رہی اور تباہی سلطنت دو ہی برس میں ہوئی۔ دلی کی سلطنت سخت جان تھی سات برس مجھ کو روٹی دے کر بگڑی۔ ایسے طالع مربی کش اور محسن سوز کہاں پیدا ہوتے ہیں[2]۔

باپ اور چچا کے انتقال کے بعد

میرا ایک بھائی کا بیٹا کہ وہ نواب ذوالفقار بہادر کی حقیقی خالہ کا بیٹا ہوتا تھا اور مسند نشین حال کا چچا تھا اور وہ میرا ہمشیر زادہ بھی تھا یعنی میں نے اپنی ممانی اور اس نے اپنی پھوپھی کا دودھ پیا تھا۔ وہ باعث ہوا تھا میرے باندا بوندیل کھنڈ آنے کا[3]

باندے جانا

---

[1] اردوئے معلیٰ ص ۱۱۱۔ [2] اردوئے معلیٰ ص ۱۱۱۔ [3] ایضاً ص ۲۴۷

سر کے درد اور تکلیف کا اثر باندہ ہی سے نہ رہا تھا . . . . . .

باندے سے کلکتہ کا سفر

دوشنبہ کو موڈہ سے روانہ ہوا۔ بیل گاڑی جس کو اس ملک میں لڑھا کہتے ہیں اسباب لے جانے کیلئے ملی۔ چونکہ مجھ سے بھی زیادہ کمزور تھی لہذا وہ آہستہ خرام بلکہ مخرام بارہ کوس کی راہ طے نہ کر سکی اور موڈہ سے چلہ تارا تک نہ پہونچی . . . . . . سہ شنبہ کو آخر شب روانہ ہوا اور میں دو گھڑی دن چڑھے چلّہ تارا کی کارواں سرا پہونچا۔ اسی مقام سے کشتی کرایہ کی لے کر آدمی اور سامان اُسی میں بھر کر بسم اللہ مجریہا و مرسہا پڑھ کر جمنا کے دھارے میں ڈال دی۔ ارادہ یہ کہ الہ آباد پہونچکر تھوڑی دیر بنارس ٹھہر سکوں[1]۔ بنارس خوب شہر ہے۔ ایک مثنوی میں نے اس کی تعریف میں لکھی ہے اور "چراغِ دیر" اس کا نام رکھا ہے[2]۔ بنارس کے ناخدا شناس ملاحوں نے کشتی دینے میں تکرار کی۔ کلکتہ تک کا سو روپے سے کم نہیں مانگتے تھے اور پٹنے تک کے بیس[2] روپے سے زیادہ چاہتے تھے۔ ناچار اسی گھوڑے پر سوار جنگل کا راستہ طے کروں گا۔ چونکہ کشتی کا خیال ابھی ہے لہذا پٹنہ پہونچکر تلاش کروں گا[3] . . . . . . بُدھ کے دن چہارم شعبان کو کچھ دن نکلا تھا کہ کلکتے پہونچا۔ خدائے بے منت کی بندہ

کلکتے پہونچنا

نوازیوں پر مجھے ناز ہے کہ ایسے شہر میں ایسا مکان مجھ کو ملا جس میں ہر طرح کا آرام ہے[4]۔ میں جس مکان میں اترا ہوں شملہ بازار میں ہے۔

کلکتے کی آب و ہوا

خدا کی رحمت ہے کہ کلکتہ کی آب ہوا میرے موافق ہوئی۔ اس خطّہ میں ایسے آرام سے ہوں جیسے وطن میں رہا ہوں۔

---

[1] پنج آہنگ صفحہ ۱۶۴۔ [2] اُردوئے معلیٰ صفحہ ۳۔ [3] پنج آہنگ صفحہ ۱۶۴۔ [4] پنج آہنگ

(رباعی) غالب ہر پردہ نوائے دارد — ہر گوشۂ از دہر فضائے دارد
ہر چند ہویست ار دماغم یکسر — بنگالہ شگرف آب و ہوائے دارد[1]

ایک ادبی ہنگامہ

اس مقام کے سخنوروں اور نکتہ رسوں نے مجھ خاکسار کی آمد پر ایک بزم سخن آراستہ کی۔ ہر انگریزی مہینے میں بروز یکشنبہ بہترین شعرا سرکار کمپنی کے مدرسے میں جمع ہوتے اور ہندی و فارسی غزلیں پڑھتے۔ اتفاق سے ایک بزرگ جو ہرات سے سفیر ہو کر تشریف لائے تھے اسی انجمن میں آئے اور میرے اشعار سُن کر باواز بلند تعریف کی اور اس ملک کے شاعروں کے کلام پر چپکے چپکے مُسکراتے رہے۔ چونکہ طبیعتیں خود نمائی پسند کرتی ہیں اس لئے حسد کرتی ہیں۔ بزرگان انجمن و فرزانگانِ فن نے میری دو بیتوں پر نادرست اعتراض کئے اور ان کو مشہور کیا۔ اس سے پیشتر کہ میں جواب دوں مخدومی و ملاذی نواب علی اکبر خاں و مکرمی و مطاعی مولوی محمد محسن نے جواب دیئے اور وہ لوگ خاموش ہو بیٹھے۔ چنانچہ ان ہی دو بزرگوں کے کہنے سے میں نے ایک مثنوی کہی اور اپنے اظہار عجز و انکسار کے بعد اس مثنوی میں اعتراض کے جواب دیئے۔ اس مثنوی (یعنی مثنوی "باد مخالف") کو ایک عالم نے پسند کیا۔[2]

خلعت ملنا

نواب گورنر جنرل سے ملنے کی درخواست کی۔ دفتر دیکھا گیا۔ میری ریاست کا حال معلوم کیا گیا۔ ملازمت ہوئی۔ سات پارچے اور جیغہ سر پیچ مالائے مروارید یہ تین رقم کا خلعت ملا۔ زاں بعد جب جب دلی

---

[1] پنج آہنگ صفحہ ۱۶ — [2] پنج آہنگ

میں دربار ہوا مجھ کو یہی خلعت ملتا رہا۔ بعد غدر بجرم مصاحبت بہادر شاہ دربار و خلعت دونوں بند ہو گئے۔ میری بریت کی درخواست گذری۔ تحقیقات ہوتی رہی۔ تین برس بعد پنڈ چھٹا۔ اب خلعت معمولی ملا[1]۔

خطاب

نوابی کا مجھ کو خطاب ہے نجم الدولہ اور اطراف و جوانب کے امرا مجھ کو نواب لکھتے ہیں[2]۔

---

[1] اردوئے معلیٰ صفحہ ۲۵۔ [2] اردوئے معلیٰ صفحہ ۲۹۱

دوسرا باب

خاندانی میل جول

(منشی شیونراین) کے دادا کے والد عہد نجف خاں وہمدانی میں میرے نانا صاحب مرحوم خواجہ غلام حسین خاں کے رفیق تھے۔ جب میرے نانا نے نوکری ترک کی اور گھر بیٹھے تو (شیونراین صاحب کے) پر دادا نے بھی کمر کھولی اور پھر کہیں نوکری نہ کی۔ یہ باتیں میرے ہوش کے پہلے کی ہیں مگر جب میں جوان ہوا تو میں نے دیکھا کہ منشی بنسی دھر، خاں صاحب کے ساتھ ہیں اور انہوں نے جو کھم گاؤں اپنی جاگیر کا سرکار میں

منشی بنسی دھر

دعویٰ کیا ہے تو بنسی دھر اس امر کے منصرم ہیں اور وکالت اور مختاری کرتے ہیں۔ میں اور وہ ہم عمر تھے۔ شاید منشی بنسی دھر مجھ سے ایک دو برس بڑے ہیں یا چھوٹے ہیں۔ اُنیس بیس برس کی میری عمر اور ایسی ہی عمر اُنکی۔

شطرنج کا شوق۔ ذاتی مکان

باہم شطرنج اور اختلاط اور محبت آدھی رات گزر جاتی تھی چونکہ گھر اُن کا بہت دُور نہ تھا۔ اس واسطے جب چاہتے تھے چلے جاتے تھے۔ بس ہمارے اور اُن کے مکان میں چھیا رنڈی کا گھر اور ہمارے دو کٹڑے درمیان تھے۔ ہماری بڑی حویلی وہ ہے جو اب لکھمی چند سیٹھ نے مول لی ہے اسی کے دروازے کی سنگین بارہ دری پر میری نشست تھی اور پاس اس کے ایک کھٹیا والی حویلی اور

سلیم شاہ کے پاس دوسری حویلی اور کالے محل سے لگی ہوئی ایک اور حویلی اور اس سے آگے بڑھ کر ایک کٹرہ کہ وہ گڈریوں والا مشہور تھا اور ایک کٹرہ کہ وہ کشمیرن والا کہلاتا تھا۔ اس کٹرہ کے ایک کوٹھے پر میں پتنگ اڑاتا تھا اور راجہ بلوان سنگھ سے پتنگ لڑا کرتے تھے[۱]۔ میرا قد بھی درازی میں انگشت نما ہے...... جب جیتا تھا تو میرا رنگ چنپئی تھا اور دیدہ ور لوگ اسکی ستائش کیا کرتے تھے۔ اب جو کبھی مجھ کو وہ اپنا رنگ یاد آتا ہے تو چھاتی پر سانپ سا پھر جاتا ہے..... جب داڑھی مونچھ میں بال سفید آ گئے۔ تیسرے دن چیونٹی کے انڈے گالوں پر نظر آنے لگے۔ اس سے بڑھ کر یہ ہوا کہ آگے کے دو دانت ٹوٹ گئے ناچار مسی بھی چھوڑ دی اور داڑھی بھی[۲]۔

پتنگ کا شوق

عہد شباب

بھئی مغل بچے بھی غضب کے ہوتے ہیں۔ جس پر مرتے ہیں اسکو مار رکھتے ہیں۔ میں بھی مغل بچہ ہوں۔ عمر بھر میں ایک بڑی ستم پیشہ ڈومنی کو میں نے مار رکھا ہے۔ چالیس بیالیس برس کا یہ واقعہ ہے۔ باآنکہ یہ کوچہ چھوٹ گیا۔ اس فن سے میں بیگانۂ محض ہو گیا ہوں لیکن اب بھی کبھی کبھی وہ ادائیں یاد آتی ہیں۔ اس کا مرنا زندگی بھر نہ بھولوں گا[۳]۔

داستانِ عشق

پینسٹھ برس کی عمر ہے۔ پچاس برس عالم رنگ و بو کی سیر کی۔ ابتدائے شباب میں ایک مرشد کامل نے یہ نصیحت کی ہے کہ ہم کو زہد و ورع منظور نہیں۔ ہم مانع فسق و فجور نہیں۔ پیو کھاؤ۔

ایک نصیحت پہ عمل

۱؎ اردوئے معلیٰ صفحہ ۲۹۲۔ ۲؎ ایضاً صفحہ ۲۰۸۔ ۳؎ ایضاً صفحہ ۲۰۷۔

مزے اُڑاؤ مگر یاد رہے کہ مصری کی مکھی بنو۔ شہد کی مکھی نہ بنو۔ سو میرا اس نصیحت پر عمل رہا۔ میں جب بہشت کا تصور کرتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ اگر معرفت ہو گئی اور ایک قصر ملا اور ایک حور ملی۔ اقامت جاودانی ہے اور اس نیک بخت کے ساتھ زندگانی ہے۔ اس تصور سے جی گھبراتا ہے اور کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ ہے ہے وہ حور اجیرن ہو جائے گی طبیعت کیوں نہ گھبرائے گی۔ وہی زمردیں کاخ اور وہی طوبیٰ کی ایک شاخ۔ چشم بد دور۔ وہی ایک حور۔[1]

شادی

۷ رجب ۱۲۲۵ھ کو میرے پاس حکم دوام حبس صادر ہوا۔ ایک بیڑی میرے پاؤں میں ڈال دی اور دلی شہر کو زندان مقرر کیا اور مجھے اس زندان میں ڈال دیا۔[2] اللہ اللہ ایک وہ کہ دو بار ان کی بیڑیاں کٹ چکی ہیں اور ایک ہم ہیں کہ ایک اُوپر پچاس برس سے جو پھانسی کا پھندا گلے میں پڑا ہے تو نہ پھندا ہی ٹوٹتا ہے نہ دم ہی نکلتا ہے۔[3]

اولاد

میں لم یلد ولم یولد ہوں۔[4] چھتر برس کی عمر میں سات بچے پیدا ہوئے۔ لڑکے بھی اور لڑکیاں بھی اور کسی کی عمر پندرہ مہینے سے زیادہ نہ ہوئی۔[5]

زین العابدین خاں عارف اور ان کے بچے

زین العابدین خاں عارف میرے سالے کا بیٹا۔[6] مرحوم میرا فرزند تھا اور اب اس کے دونوں بچے کہ وہ میرے پوتے ہیں میرے پاس آرہے ہیں اور دمبدم مجھ کو ستاتے ہیں اور میں تحمل کرتا ہوں۔[7] مجھے کھانا نہیں کھانے دیتے۔ مجھ کو دوپہر

۱؎ اردوئے معلیٰ صفحہ ۲۰۹۔ ۲؎ ایضاً صفحہ ۳۲۵۔ ۳؎ ایضاً صفحہ ۴۸۔ ۴؎ ایضاً صفحہ ۳۱۶

۵؎ ایضاً صفحہ ۱۲۔ ۶؎ ایضاً صفحہ ۴۲ ۷؎ ایضاً صفحہ ۵۰۔

سونے نہیں دیتے۔ ننگے ننگے پاؤں پلنگ پر رکھتے ہیں۔ کہیں پانی لڑھاتے
ہیں۔ کہیں خاک اُڑاتے ہیں۔ میں نہیں تنگ آتا[1]۔ لڑکے دونوں اچھی
طرح ہیں[2]۔ بڑا لڑکا باقر علی خاں ...... میرا
پیارا بیٹا حسین علی خاں .... وہی حسین علیخاں

باقر علی خاں و حسین علی خاں

جس کا روزمرہ ہے "کھلونے منگا دو۔ میں بھی بجار جاؤں گا"[3] کبھی میرا دل
بہلاتے ہیں۔ کبھی مجھ کو ستاتے ہیں۔ بکریاں۔ کبوتر۔ بٹیریں۔ تکل۔ کنکوا۔
سب سامان درست ہے۔ فروری مہینے کے دو دو روپیہ لے کر دس دن
میں اُٹھا ڈالے۔ پھر پرسوں چھوٹے صاحب آئے کہ "دادا جان! کچھ ہم کو
قرض حسنہ دو۔" ایک روپیہ دونوں کو قرض حسنہ دیا گیا۔ آج ۱۴ ہے مہینہ
دور ہے۔ دیکھئے کے بار قرض حسنہ لیں گے[4]۔ خدا نے لاولد رکھا تھا شکر بجا لاتا
تھا۔ خدا نے میرا شکر مقبول و منظور نہ کیا۔ یہ بلا بھی قبیلے داری کی شکل کا نتیجہ
ہے۔ یعنی جس لوہے کا طوق اسی لوہے کی دو ہتھکڑیاں پڑ گئیں۔ خیر اس کا
کیا رونا ہے۔ یہ قید جاودانی ہے[5]۔

---

[1] اُردوئے معلیٰ صفحہ ۵۷۔ [2] ایضاً صفحہ ۱۸۷۔ [3] ایضاً صفحہ ۱۵۳۔ [4] ایضاً صفحہ ۱۸۷۔ [5] ایضاً صفحہ ۱۵۳۔

تیسرا باب (۳)

کرایہ کا مکان

میرا مکان گھر کا نہیں ہے کرایہ کی حویلی میں رہتا ہوں[۱] ۔میں دس بارہ برس سے حکیم محمد حسن خاں کی حویلی میں رہتا ہوں۔اب وہ حویلی غلام اللہ خاں نے مول لے لی ہے۔آخر جون میں مجھ سے کہا کہ وہ حویلی خالی کر دو اب مجھے فکر پڑی کہ کہیں دو حویلیاں قریب ہم گر ایسی ملیں کہ ایک محلسرا اور ایک دیوانخانہ ہو۔ نہ ملیں۔ناچار یہ چاہا کہ بلی ماروں میں ایک مکان ایسا ملے کہ جس میں جا رہوں ۔نہ ملا۔

کڑوڑا والی حویلی

(مرزا علاءالدین خاں بہادر) کی چھوٹی پھوپی نے بیکس نوازی کی ۔ کڑوڑا والی حویلی مجھ کو رہنے کو دی ہر چند وہ رعایت مرعی نہ رہی کہ محلسرا سے قریب ہو مگر خیر بہت دور بھی نہیں ۔کل یا پرسوں وہاں جا رہوں گا[۲]۔

۱۸۶۴ء میں مکان کی حالت

میں بڑی مصیبت میں ہوں۔محلسرا کی دیواریں گر گئی ہیں پاخانہ ڈھ گیا۔چھتیں ٹپک رہی ہیں (مرزا علاءالدین خاں بہادر کی) پھوپھی کہتی ہیں" ہائے دبی۔ہائے مری"۔ دیوانخانہ کا حال محلسرا سے بدتر ہے۔میں مرنے سے نہیں ڈرتا۔فقدان راحت سے گھبرا گیا ہوں۔چھت چھلنی ہے۔ابر دو گھنٹے برسے تو چھت چار گھنٹے برستی ہے۔مالک اگر چاہے کہ مرمت کرے

---

[۱] اردوئے معلیٰ صفحہ ۲۰۷۔ [۲] ایضاً صفحہ ۳۲۸۔

تو کیونکر کرے۔ مینھ کھلے تو سب کچھ ہو اور پھر اثنائے مرمت میں بیٹھا کس طرح رہوں اگر تم سے (علاء الدین خاں) ہوسکے تو بھائی سے مجھ کو وہ حویلی رہنے کو اور کوٹھی

برسات میں نقل مکان کی فکر

میں سے وہ بالاخانہ مع دالان زیریں جو الٰہی بخش خاں کا مسکن تھا میرے رہنے کو دلوا دو۔ برسات گذر جائیگی مرمت ہو جائے گی۔ پھر صاحب اور میم اور بابا لوگ اپنے قدیم مسکن میں آرہینگے۔[۱]

حویلی کا ملنا

تم نے میانجگری کے بھائی نے برادر پروری کی۔ تم جیتے رہو۔ وہ سلامت رہیں۔ ہم اس حویلی میں تا قیامت رہیں۔ اس ابہام کی توضیح اور اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ مینھ کی شدّت سے چھوٹا لڑکا ڈرنے لگا۔ اس کی دادی بھی گھبرائی۔ مجھ کو خلوت خانہ کا دروازہ غرب رویہ اور اس کے آگے ایک چھوٹا سا سہ درہ یا دتھا...... یہ سمجھ کر خلوت خانے کو محلسرا بنانا چاہتا تھا کہ گاڑی، ڈولی، لونڈی، اصیل، کاچھن، تیلن، تنبولن، کہاری، پسنہاری ان فرقوں کا ممر دہ دروازہ رہیگا۔ میری اور میرے بچوں کی آمد و رفت دیوانخانہ میں رہے گی۔ عیاذاً باللہ وہ لوگ دیوان خانہ میں آئیں جائیں۔ اپنے بیگانے کو ہر وقت چھلپا پیاں نظر آئیں اس سہ دری کو اپنے آدمیوں اور لڑکوں کے مکتب کے لئے ہرگز کافی نہ جانا۔ مور اور کبوتر اور دُنبہ اور بکری باہر گھوڑوں کے پاس رہ سکتے تھے۔ عرفتُ ربّی بفسخ العزائم پڑھا اور چپ رہا۔[۲]

---

[۱] اُردوئے معلی صفحہ ۳۶۳۔ [۲] ایضاً صفحہ ۳۵۷۔

صورتِ اطمینان

اسباب وحشت و خوف و خطراب نہ رہے۔ مینھ کھل گیا ہے۔ مکان کے مالکوں کی طرف سے مدد شروع ہوگئی ہے نہ لڑکا ڈرتا ہے۔ نہ بی بی گھبراتی ہے۔ نہ میں بے آرام ہوں۔ کھلا ہوا کوٹھا۔ چاندنی رات، ہوا سرد۔ تمام رات فلک پر مریخ پیش نظر۔ دو گھڑی کے تڑکے زہرہ جلوہ گر۔ ادھر چاند مغرب میں ڈوبا اُدھر مشرق سے زہرہ نکلی۔ صبوحی کا وہ لطف، روشنی کا وہ عالم[۵۱]

برسات کی تکلیف

برسات کا حال نہ پوچھو۔ خدا کا قہر ہے۔ قاسم خاں کی گلی سعادت خاں کی نہر ہے۔ میں جس مکان میں رہتا ہوں عالم بیگ خاں کے کٹرہ کی طرف کا دروازہ گر گیا۔ مسجد کی طرف کے دالان کو جاتے ہوئے جو دروازہ تھا گر گیا۔ سیڑھیاں گرا چاہتی ہیں۔ صبح کے بیٹھنے کا حجرہ جھک رہا ہے۔ چھتیں چھلنی ہوگئیں۔ مینھ گھڑی بھر برسے تو چھت گھنٹہ بھر برسے۔ کتابیں قلمدان سب توشہ خانہ میں۔ فرش پر کہیں لگن رکھا ہوا ہے کہیں چلمچی دھری ہوئی ہے۔[۵۲]

---

۵۱ اُردوئے معلیٰ صفحہ ۳۵۷۔ ۵۲ ایضاً صفحہ ۱۴۲۔

چوتھا باب (۴)

خواہم از بند بہ زنداں سخن آغاز کنم
غمِ دل پردہ دری کرد فغاں ساز کنم

حادثۂ اسیری

کوتوال دشمن تھا اور مجسٹریٹ ناواقف۔ فتنہ گھات میں تھا اور ستارہ گردش میں۔ باوجودیکہ مجسٹریٹ کوتوال کا حاکم ہے میرے باب میں وہ کوتوال کا محکوم بن گیا اور میری قید کا حکم صادر کر دیا۔ سشن جج باوجودیکہ میرا دوست تھا اور ہمیشہ مجھ سے دوستی اور مہربانی کے برتاؤ برتتا تھا اور اکثر صحبتوں میں بے تکلف ملتا تھا اس نے بھی اغماض کیا اور تغافل اختیار کیا۔ صدر میں اپیل کی گئی مگر کسی نے نہ سُنی اور وہی حکم بحال رہا۔ پھر معلوم نہیں کیا باعث ہوا کہ جب آدھی میعاد گذر گئی تو مجسٹریٹ کو رحم آیا اور صدر میں میری رپورٹ کی اور وہاں سے حکم رہائی کا آگیا۔ اور حکام صدر نے ایسی رپورٹ بھیجنے پر اس کی بہت تعریف کی۔ سُنا ہے رحمدل حاکموں نے مجسٹریٹ کی بہت تعریفیں کیں اور میری خاکساری اور آزادہ روی سے اس کو مطلع کیا۔ یہاں تک اُس نے خود میری رہائی کی رپورٹ بھیجی۔ اگرچہ میں ہر کام کو خدا کی طرف سے سمجھتا ہوں اور خدا سے لڑ نہیں سکتا۔ جو کچھ گذرا اس کے ننگ سے آزاد اور جو کچھ گذرنے والا ہے اس پر راضی ہوں مگر آرزو کرنا آئین عبودیت

ہے کہ اب دنیا میں نہ رہوں اور اگر رہوں ہندوستان میں نہ رہوں۔ رُوم ہے۔ مصر ہے۔ ایران ہے۔ بغداد ہے۔ یہ بھی جانے دو۔ خود کعبہ آزادوں کی جائے پناہ ہے اور آستان رحمۃ العالمین دلدادوں کی تکیہ گاہ ہے۔ دیکھئے وہ وقت کب آئے گا کہ درماندگی کی قید سے جو اس گذری ہوئی قید سے زیادہ جاں فرسا ہے نجات پاؤں اور بغیر اس کے کہ کوئی منزل مقصود قرار دوں سر اصحرا نکل جاؤں۔ یہ ہے جو کچھ کہ مجھ پر گذر رہا ہے۔ یہ ہے جس کا میں آرزو مند ہوں ؎

بہر آزارِ غم از قید فرنگم نبود — رازِ دانا غمِ رسوائی جاوید بلاست

طعن احباب کم از زخم خدنگم نبود — جورِ اعدا رو داز دل بہ رہائی ممکن

آغازِ غدر

۱۶ ماہ رمضان ۱۲۷۳ھ مطابق ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء کو علی الصباح یکایک دہلی کی شہر پناہ اور قلعہ کی در و دیوار میں زلزلہ پیدا ہوا یعنی میرٹھ چھاؤنی سے کچھ باغی سپاہی بھاگ کر دہلی آئے سب کے سب بغاوت پر کمر بستہ اور انگریزوں کے خون کے پیاسے تھے۔ شہر پناہ کے محافظوں نے جو باغیوں کے ساتھ ہم پیشہ ہونے کی وجہ سے قدرتاً ہمدردی رکھتے تھے اور جو ممکن ہے پہلے سے ان کے ساتھ عہد و پیمان بھی کر چکے ہوں دروازے کھول دیئے اور حق نمک اور حفاظت شہر کو بالائے طاق رکھ کر ان ناخواندہ یا خواندہ مہمانوں کا خیر مقدم کیا۔ ان سُبک عنان سواروں اور تیز رفتار پیادوں نے جب شہر کے دروازوں کو کُھلا ہوا اور دربانوں کو مہمان نواز پایا تو دیوانہ وار ہر طرف دوڑ پڑے اور جہاں جہاں انگریز افسروں کو پایا قتل کر ڈالا اور اُن کی کوٹھیوں میں آگ لگا دی۔ اہل شہر کو جو سرکار انگریزی کے نمک خوار تھے اور حکومتِ

انگریزی کے سایہ میں امن وامان کے ساتھ زندگی بسر کر رہے تھے۔ ہتھیار سے بیگانہ۔ تیر و تبر میں بھی امتیاز نہ کر سکتے تھے۔ نہ ہاتھ میں تیر رکھتے تھے نہ شمشیر سچ پوچھو تو یہ لوگ صرف اس مطلب کے تھے کہ گلی کوچوں کو آباد کریں۔ اس گوں کے ہرگز نہ تھے کہ جنگ و جدل کے واسطے کمر بستہ ہوں۔ ان غریبوں نے اپنے آپ کو اس آفت ناگہانی کے آگے عاجز اور بے بس پایا اس لئے گھروں کے اندر غم اور ماتم میں بیٹھ رہے۔ بندہ بھی انھیں ماتم زدگان میں سے ہے۔ گھر میں بیٹھا تھا کہ شور و غوغا بلند ہوا، قبل اس کے کہ سبب دریافت ہو چشم زدن میں صاحب ایجنٹ بہادر کے قلعہ میں مارے جانے کی خبر آئی ساتھ ہی معلوم ہوا کہ سوار اور پیادے ہر گلی کوچہ میں گشت لگا رہے ہیں پھر تو کوئی جگہ ایسی نہ تھی جو گل اندامو ں کے خون سے رنگیں نہ ہو.......

گولہ باری

انگریزوں کے پاس علاقہ دہلی میں سوائے اس پہاڑی کے جو شہر میں واقع ہے اور کچھ باقی نہ رہا چنانچہ ان اہل دانش نے اسی جائے تنگ میں دمدمے اور مورچے بنائے اور ان پر زبردست توپیں لگائیں۔ دیسیوں نے بھی جو توپیں میگزین سے اُڑائی تھیں اُن کو لے جا کر قلعہ میں نصب کیا اور دونوں جانب سے گولہ باری شروع ہوئی۔

شہر پر قبضہ

۱۴ ستمبر ۵۷ء کو انگریزی سپاہ نے اس شدومد کے ساتھ کشمیری دروازہ پر گولہ باری کی کہ کالوں کی سپاہ میں بھاگڑ پڑ گئی اگرچہ گیارہ مئی سے چودھویں ستمبر تک چار ماہ اور چار روز کا وقفہ تھا لیکن چونکہ شہر دوشنبہ ہی کے روز ہاتھ سے نکلا اور دوشنبہ ہی کو پھر قبضہ میں آگیا۔ اسلئے

کہہ سکتے ہیں کہ ایک ہی دن کے اندر شہر ہاتھ سے نکلا اور ہاتھ میں آگیا۔[۱]

ایامِ غدر میں

سہ شنبہ ۱۹ جنوری ۱۸۵۸ء اس وقت تک میں مع عیال و اطفال جیتا ہوں۔ بعد گھڑی بھر کے کیا ہو کچھ معلوم نہیں۔ قلم ہاتھ میں لئے پر جی بہت لکھنے کو چاہتا ہے مگر کچھ نہیں لکھ سکتا۔[۲] میں غریب شاعر دس برس سے

بادشاہ کی ملازمت

تاریخ لکھنے اور شعر کی اصلاح دینے پر متعلق ہوا ہوں خواہی اس کو نوکری سمجھو خواہی مزدوری جانو۔ اس فتنہ و آشوب میں کسی مصلحت میں میں نے دخل نہیں دیا۔ صرف اشعار کی خدمت بجالاتا رہا اور نظر اپنی بے گناہی پر۔ شہر سے نکلا نہیں گیا۔[۳] میں مع زن و فرزند ہر وقت اسی شہر میں قلزم خوں کا شناور رہا ہوں۔ دروازہ سے باہر قدم نہیں رکھا۔ نہ پکڑا گیا نہ قید ہوا نہ مارا گیا۔ کیا عرض کروں کہ میرے خدا نے مجھ پر کیسی عنایت کی اور کیا نفس مطمئنہ بخشا۔ جان و مال و آبرو میں کسی طرح کا فرق نہیں آیا۔[۴]

دار و گیر سے محفوظ

دفتر شاہی میں میرا نام مندرج نہیں نکلا۔ کسی خبر نے نسبت میرے کوئی خبر بدخواہی کی نہیں دی۔ روپوش نہیں ہوں۔ بلایا نہیں گیا۔ دار و گیر سے محفوظ ہوں۔ کسی طرح کی بازپرس ہو تو بلایا جاؤں مگر ہاں جیسا کہ بلایا نہیں گیا خود بھی بروئے کار نہیں آیا۔ کسی سے درخواست ملاقات نہیں کی۔ مئی سے پنشن نہیں پاتا۔ کہو یہ دس مہینے کیونکر گذرے ہونگے انجام کچھ نظر آتا نہیں کہ کیا ہوگا۔ زندہ ہوں مگر زندگی وبال ہے۔[۵]

---

[۱] از ترجمہ دستنبو۔ [۲] اردوئے معلی صفحہ ۶۰۔ [۳] ایضاً صفحہ ۱۱۰۔ [۴] ایضاً صفحہ ۱۱۰۔ [۵] ایضاً صفحہ ۶۱

قیمتی اشیاء

بیگم صاحبہ نے بغیر مجھ سے کہے ہوئے قیمتی اشیا، مثلاً زیور، کپڑے جو کچھ تھے چھپا کر کالے صاحب پیرزادہ کے مکان بھجوا دیئے تاکہ وہاں تہ خانے میں محفوظ رہیں اور دروازہ مٹی سے بند کر دیا۔ جب لشکرکشوں نے شہر فتح کر لیا اور سپاہیوں کو لوٹ کا حکم ملا تو اس راز کے رازداں نے مجھ سے تبلایا مگر اب وہ ہاتھ سے جا چکا تھا اور اب جانے اور اس کے لانے کا موقع نہ تھا۔ میں نے افسوس کیا اور یوں تسلی دی کہ جانے والی چیز تھی اچھا ہوا کہ میرے گھر سے نہیں گئی۔

دوستوں کی آمد و رفت موقوف

غرض کہ ایک مکان میں بیٹھا ہوں۔ دروازے سے باہر نہیں نکل سکتا۔ سوار ہونا اور کہیں جانا تو بڑی بات ہے۔ رہا یہ کوئی میرے پاس آوے شہر میں ہے کون جو آوے[1]! انصاف کرو کیسا کثیر الاحباب آدمی تھا۔ کوئی وقت ایسا نہ تھا کہ میرے پاس دو چار دوست نہ ہوتے ہوں۔ اب زائد یاروں میں ایک شیو جی رام برہمن اور بالمکند اس کا بیٹا یہ دو شخص ہیں کہ گاہ گاہ آتے ہیں[2]۔ گھر کے گھر بے چراغ پڑے ہیں مجرم سیاست پاتے جاتے ہیں۔ جرنیلی بندوبست ہے[3]۔

دلی

دلی کی ہستی منحصر کئی ہنگاموں پر ہے۔ قلعہ، چاندنی چوک، ہر روز مجمع بازار جامع مسجد کا۔ ہر ہفتے سیر جمنا کے پل کی۔ ہر سال میلہ پھول والوں کا۔ یہ پانچوں باتیں اب نہیں۔ پھر کہو دلی کہاں۔ ہاں کوئی شہر قلمرو ہند میں اس

---

[1] اردوئے معلیٰ صفحہ ۶۰۔ [2] ایضاً صفحہ ۵۵۔ [3] ایضاً صفحہ ۶۰۔

نام کا تھا۔

جامع مسجد

جامع مسجد کے گرد پچیس پچیس فٹ گول میدان نکلے گا۔ دوکانیں حویلیاں ڈھائی جائیں گی۔ دارالبقا فنا ہو جائے گی۔ رہے نام اللہ کا۔[۵۱]

دریافت حال

پرسوں میں سوار ہو کر کوؤں کا حال دریافت کرنے گیا تھا۔ مسجد جامع سے راج گھاٹ کے دروازے تک بے مبالغہ ایک صحرائے لق و دق ہے۔ اینٹوں کے ڈھیر جو پڑے ہیں اگر اُٹھ جائیں تو ہُو کا مکان ہو جائے۔

پنشن اور اس کی موقوفی

۵۳ برس کی پنشن تقرر اس کا بہ تجویز لارڈ لیک و منظوری گورنمنٹ[۵۲]۔ اکیس مہینے سے بند اور میں سادہ دل فتوح جدید کا آرزومند۔ اس پنشن کا احاطہ پنجاب کے حکام پر مدار ہے۔ سوال کا یہ شیوہ اور شعار ہے کہ نہ روپیہ دیتے ہیں نہ جواب۔ نہ مہربانی کرتے ہیں نہ عتاب۔ خیر اس سے قطع نظر کی۔ اب سُنیے ادھر کی ۱۸۵۶ء سے بموجب تحریر وزیر عطیۂ شاہی کا امیدوار ہوں۔ تقاضا کرتے ہوئے شرماؤں اگر گنہگار ہوں۔ گنہگار ٹھہرتا تو گولی یا پھانسی سے مرتا۔ اس بات پر کہ میں بے گناہ ہوں مفید اور مقبول نہ ہونے سے آپ اپنا گواہ ہوں۔ پیشگاہ گورنمنٹ کلکتہ میں

حاکم کی بے التفاتی

جب کاغذ بھجوایا بقلم چیف سکریٹری بہادر اس کا جواب پایا ہے۔ اب کی بار دو کتابیں بھیجیں ایک پیشکش گورنمنٹ اور

---

[۵۱] اردوئے معلٰی۔ [۵۲] ایضاً صفحہ ۲۷۸

ایک نذر شاہی ہے۔ نہ اس کے قبول کی اطلاع نہ اس کے ارسال سے آگاہی ہے۔[۱]

نا داری

اس وقت کلو کے پاس ایک روپیہ سات آنے باقی ہیں بعد اس کے نہ کہیں قرض کی اُمید ہے نہ کوئی جنس رہن و بیع کے قابل۔ اگر رامپور سے کچھ آیا تو خیر ورنہ انا للہ راجعون۔ بعض لوگ یہ بھی گمان کرتے ہیں کہ اس مہینے میں تقسیم کا حکم آجائے گا۔ دیکھئے آتا ہے یا نہیں۔ اگر آتا ہے تو میں مقبولوں میں ہوں یا مردودوں میں۔[۲]

میرا درباری خلعت دریا بُرد ہو گیا۔ نہ پنشن کی توقع نہ دربار و خلعت کی صورت۔ نہ سزا نہ انعام نہ رسم معمولی قدیم۔[۳]

رامپور کا قصد

میں تو پنشن کے باب میں حکم اخیر سُن لوں پھر رامپور چلا جاؤنگا۔ جمادی الاول سے ذی الحجہ تک ۸ مہینے اور پھر محرم سے ۱۲۷۷ھ سال شروع ہوگا۔ اس سال کی دو چار حد دس گیارہ مہینے۔ غرض کہ اُنیس بیس مہینے ہر طرح بسر کرنے ہیں۔ اس میں رنج و راحت و ذلّت و عزّت جو مقسوم میں ہے وہ پہونچ جائے اور پھر علیؑ علیؑ کہتا ہوا ملک عدم چلا جاؤں۔ جسم رامپور میں اور روح عالم نور میں۔[۴]

میرٹھ کا سفر

میں مصطفٰے خاں کی ملاقات کو بہ سبیل ڈاک میرٹھ گیا تھا۔ تین دن وہاں رہا۔ کل وہاں سے واپس آیا۔[۵]

---

[۱] اُردوئے معلی ۲۷۸۔ [۲] ایضاً صفحہ ۲۷۸۔ [۳] ایضاً صفحہ ۲۶۹۔ [۴] ایضاً صفحہ ۲۸۴۔
[۵] ایضاً صفحہ ۴۲۔

روز اس شہر میں اک حکم نیا ہوتا ہے
کچھ سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ کیا ہوتا ہے

نیا حکم

میرٹھ سے آکر دیکھا کہ یہاں بڑی شدّت ہے اور یہ حالت ہے کہ گوروں کی پاسبانی پر قناعت نہیں۔ لاہوری دروازے کا تھانیدار مونڈھا بچھا کر سڑک پر بیٹھا ہے جو باہر کے گورے کی آنکھ بچا کر آتا ہے اس کو پکڑ کر حوالات میں بھیج دیتا ہے۔ حاکم کے ہاں پانچ پانچ بید لگتے ہیں یا دو روپیہ جرمانہ لیا جاتا ہے آٹھ دن قید رہتا ہے۔

ٹکٹ

اب یہاں ٹکٹ چھاپے گئے ہیں۔ میں نے بھی دیکھے۔ فارسی عبارت یہ ہے "ٹکٹ آبادی درون شہر بہ شرط ادخال جرمانہ۔" مقدار روپے کی حاکم کی رائے پر۔ آج پانچ ہزار ٹکٹ چھپ چکا ہے .... سب تھانوں پر حکم ہے کہ دریافت کرو کون بے ٹکٹ مقیم ہے اور کون ٹکٹ رکھتا ہے۔ تھانوں میں نقشے مرتب ہونے لگے۔ یہاں کا جمعدار میرے پاس بھی آیا۔ میں نے کہا "بھائی! تو مجھے نقشے میں نہ رکھ۔ میری کیفیت کی عبارت الگ لکھ۔ یہ کہ "اسد اللہ پنشندار ۱۸۵۰ء سے حکیم پٹیالہ والے کے بھائی کی حویلی میں رہتا ہے۔ نہ کالوں کے وقت میں کہیں گیا نہ گوروں کے وقت میں نکلا اور نکالا گیا۔ کرنیل براؤن صاحب کے زبانی حکم پر اُس کی اقامت کا مدار ہے۔ اب تک کسی حاکم نے وہ حکم نہیں بدلا۔ اب حاکم وقت کو اختیار ہے۔"

نواب مصطفٰے خاں

نواب مصطفٰے خاں بہ میعاد سات برس کے قید ہو گئے تھے سو اُن کی تقصیر معاف ہوئی اور ان کو رہائی ملی۔ صرف

رہائی کا حکم آیا ہے۔ جہانگیر آباد کی زمینداری اور دلّی کی املاک اور پنشن کے باب میں ہنوز کچھ نہیں ہوا۔ ناچار وہ رہا ہو کر میرٹھ میں ایک دوست کے مکان میں ٹھہرے ہیں۔ بمجرد استماع اس خبر کے ڈاک میں بیٹھ کر میرٹھ گیا ان کو دیکھا۔ چار دن وہاں رہا۔ پھر ڈاک میں اپنے گھر آیا۔

رئیس فرخ آباد

مجھ کو رشک آتا ہے جزیرہ نشینوں کے حال پر عموماً اور رئیس فرخ آباد پر خصوصاً کہ جہاز سے اُتار کر سرزمین عرب پر چھوڑ دیا۔ اہاہاہا ے

پڑیئے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیمار دار
اور اگر مر جایئے تو نوحہ خواں کوئی نہو

سکے کا وار

سکے کا وار تو مجھ پر ایسا چلا جیسے کوئی چھرا یا گولی مگر اب کس سے کہوں کس کو گواہ لاؤں۔ یہ دونوں سکے ایک وقت میں کہے گئے ہیں جب بہادر شاہ تخت پر بیٹھے تو ذوقؔ نے یہ دو سکے کہہ کر گذارے بادشاہ نے پسند کئے۔ مولوی محمد باقر جو ذوقؔ کے معتقدین میں تھے انھوں نے دلّی اُردو اخبار میں یہ دونوں سکے چھاپے۔ اس سے علاوہ اب وہ لوگ موجود ہیں کہ جنہوں نے اس زمانے میں مرشد آباد اور کلکتے میں یہ سکے سُنے ہیں اور اُن کو یاد ہیں۔ اب یہ دونوں سکے سرکار کے نزدیک میرے کہے ہوئے اور گذرانے ہوئے ثابت ہوئے۔ میں نے ہر چند قلمرو ہند میں دلی اردو اخبار کا پرچہ ڈھونڈھا کہیں ہاتھ نہیں آیا۔ یہ دھبہ مجھ پر رہا۔ پنشن بھی گئی اور وہ ریاست کا نام و نشان خلعت و دربار بھی مٹا۔ خیر جو کچھ ہوا چونکہ موافق رضائے

الٰہی کے سہے اس کا گلہ کیا؂

چوں جنبش سپہر بہ فرمان داور ست
بیداد نبود انچہ بما آسماں دہد[1]

میں نے سکّہ کہا نہیں اور اگر کہا تو اپنی جان اور حرمت بچانے کو کہا۔ یہ گناہ نہیں اور اگر گناہ بھی ہے تو ایسا کیا سنگین ہے ملکہ معظمہ کا اشتہار بھی اس کو نہ مٹا سکے۔ سبحان اللہ! گولہ انداز کا بارود بنانا اور توپیں لگانی اور بینک گھر اور میگزین کا لوٹنا معاف ہو جائے اور شاعر کے دو مصرعے معاف نہ ہوں[2]

---

[1] اردوئے معلی صفحہ ۱۰۸ ۔ [2] ایضاً صفحہ ۲۷۶

پانچواں باب

نا اُمیدی

کہتے ہیں کہ خدا سے نا اُمیدی کفر ہے۔ میں تو اپنے باب میں خدا سے نا اُمید ہو کر کافر مطلق ہو گیا۔ موافق عقیدہ اہلِ اسلام جب کافر ہو گیا تو مغفرت کی بھی توقع نہ رہی۔ چل بھئی نہ دنیا نہ دین۔ کچھ بن نہیں آتی۔ اپنا آپ تماشائی بن گیا ہوں۔ رنج و ذلت سے خوش ہوتا ہوں یعنی میں نے اپنے کو اپنا غیر تصور کیا ہے جو دُکھ مجھے پہنچتا ہے کہتا ہوں کہ "غالب کے ایک اور جوتی لگی۔ بہت اتراتا تھا کہ میں بڑا شاعر اور فارسی داں ہوں۔ آج دُور دُور تک میرا جواب نہیں۔ لے اب تو قرضہ داروں کو جواب دے"۔ سچ تو یوں ہے کہ غالبؔ کیا مرا بڑا ملحد مرا بڑا کافر مرا۔ ہم نے ازراہِ تعظیم جیسا بادشاہوں کو بعد ان کے جنت آرامگاہ و عرش نشیمن خطاب دیئے ہیں چونکہ یہ اپنے کو شاہِ قلمروِ سخن جانتا تھا۔ سقر مقر اور ہاویہ زاویہ خطاب تجویز کر رکھا ہے[۵۲]

بھائی کا انتقال

میرا حقیقی بھائی میرزا یوسف خاں دیوانہ بھی مر گیا[۵۳]؎

زسال مرگ ستم دیدہ میرزا یوسف | کہ زیستی بجہاں در زخویش بیگانہ
یکے در انجمن از من ہمی پژوہش کرد | کشیدم آہے و گفتم دریغ دیوانہ

---

[۵۱] اردوئے معلیٰ صفحہ ۲۶۳ - [۵۲] ایضاً صفحہ ۲۶۴ - [۵۳] ایضاً صفحہ ۱۲۲

کیسی پنشن اور کہاں اس کا ملنا۔ یہاں جان کے لالے پڑے ہیں ؎

ہے موجزن اک قلزمِ خوں کاش یہی ہو
آتا ہے ابھی دیکھیے کیا کیا مرے آگے

اُس کی بیٹی، اس کے چار بچے اس کی ماں یعنی میری بھاوج جے پور میں پڑے ہوئے ہیں۔ اس تین برس میں ایک روپیہ ان کو نہیں بھیجا۔ بھتیجی کیا کہتی ہوگی کہ میرا بھی کوئی چچا ہے۔ یہاں اغنیا اور امرا کے ازواج و اولاد بھیک مانگتے پھریں اور میں دیکھوں۔ اس مصیبت کی تاب لانے کو جگر چاہیئے۔ اب خاص اپنا دُکھ روتا ہوں۔ ایک بی بی۔ دو بچے تین چار آدمی گھر کے۔ کلو، کلیان، ایاز یہ باہر مداری کے جورو بچے بدستور گویا مداری موجود ہے۔

نوکر

میاں گھمن گئے، گئے مہینا بھر سے آگئے کہ بھوکا مرتا ہوں۔ اچھا بھائی تم بھی رہو۔[1] بی وفادار..... اب (مرزا علاء الدین خاں کی) پھوپھی نے انھیں وفادار بیگ بنا دیا ہے۔ باہر نکلتی ہیں۔ سودا کیا لائیں گی مگر خلیق اور ملنسار ہیں۔ رستہ چلتوں سے باتیں کرتی پھرتی ہیں۔ جب وہ محل سے نکلیں گی ممکن نہیں کہ اطراف نہر کی سیدھ نہ کریں گی۔ ممکن نہیں دروازہ کے سپاہیوں سے باتیں نہ کریں گی۔ ممکن نہیں کہ پھول نہ توڑیں اور بی بی کو لے جاکر نہ دکھائیں اور نہ کہیں "یہ پھون تائی چچا کے بیٹے کے کائی کے ایں۔" (شرح) تمہارے چچا کے بیٹے کی کیاری کے ہیں۔[2]

۱؎ اردوئے معلی صفحہ ۲۸۳۔ ۲؎ ایضاً صفحہ ۳۵۷۔ ۳؎ ایضاً صفحہ ۲۸۳

مفلسی اور فکریں

ایک پیسہ کی آمد نہیں۔ بیس آدمی روٹی کھانے والے موجود۔ مقام معلوم سے کچھ آئے جاتا ہے وہ بقدر رسد رمق ہے۔ محنت وہ ہے کہ دن رات میں فرصت کام سے کم ہوتی ہے۔ ہمیشہ ایک فکر برابر چلے جاتی ہے۔ آدمی ہوں۔ دیو نہیں۔ بھوت نہیں۔ ان رنجوں کا تحمل کیونکر کروں۔ بڑھاپا ضعفِ قوی۔ شاید کوئی دو چار گھڑی بیٹھا ہوں ورنہ پڑا رہتا ہوں گویا صاحبِ فراش ہوں۔ نہ کہیں جانے کا ٹھکانا نہ کوئی میرے پاس آنے والا۔ وہ عرق جو بقدر طاقت بنائے رکھتا تھا اب میسر نہیں۔ سب سے بڑھکر آمد آمد گورنمنٹ کا ہنگامہ۔ دربار میں جاتا تھا خلعت فاخرہ پاتا تھا۔ وہ صورت اب نظر نہیں آتی۔ نہ مقبول ہوں نہ مردود ہوں نہ بیگناہ ہوں نہ گنہگار ہوں نہ مخبر نہ مفسد اگر یہاں دربار ہوا اور میں بلایا جاؤں تو نذر کہاں سے لاؤں۔

قصیدہ

دو مہینے دن رات خون جگر کھایا اور ایک قصیدہ چونسٹھ بیت کا لکھا۔ محمد افضل مصوّر کو دیدیا۔ وہ پہلی دسمبر کو مجھ کو دے گا۔ یہ اس کا مطلع ہے ؎

زِ سال نو دگر ابے بروئے کار آمد
ہزار و ہشتصد و شست در شمار آمد

جامِ بے آتش سیال

صبح کا وقت ہے۔ جاڑا خوب پڑ رہا ہے۔ انگیٹھی سامنے رکھی ہوئی ہے۔ دو حرف لکھتا ہوں ہاتھ تاپتا جاتا ہوں۔ آگ میں گرمی نہیں مگر ہائے آتش سیال کہاں کہ جب دو جرعہ پی لی فوراً رگ و پے میں دوڑ گئی۔ دل توانا ہوگیا۔ دماغ روشن ہوگیا۔ نفس ناطقہ کو تواجد بہم پہنچا

ساقی کوثر کا بندہ اور تشنہ لب۔ ہائے غضب۔ ہائے غضب[1]۔ ۱۵ دن پہلے تک دن کو روٹی رات کو شراب ملتی تھی۔ اب صرف روٹی ملتی جاتی ہے۔ شراب نہیں۔ کپڑا ایام تنعم کا بنا ہوا ابھی ہے۔ اس کی کچھ فکر مجھ کو نہیں ہے[2]۔ بے رزق جینے کا ڈھب مجھ کو آگیا ہے۔ اس طرف سے خاطر جمع رکھنا۔ رمضان کا مہینہ روزہ کھا کھا کر کاٹا۔ آئندہ خدا رازق ہے۔ کچھ اور کھانے کو نہ ملا تو غم تو ہے۔ بس صاحب جب ایک چیز کھانے کو ہوئی اگرچہ غم ہی ہو تو پھر کیا غم ہے[3]۔

شراب کی گرانی

آبکاری کے بندوبست جدید نے مارا۔ عرق کے نہ کھنچنے کی قید شدید نے مارا۔ ادھر انسداد دروازہ آبکاری ہے۔ ادھر ولایتی عرق کی قیمت بھاری ہے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

غلے کی گرانی

غلّہ گراں ہے۔ موت ارزاں ہے۔ میوہ کے مول اناج بکتا ہے۔ ماش کی دال آٹھ سیر۔ باجرہ بارہ سیر۔ گیہوں تیرہ سیر۔ چنے سولہ سیر۔ گھی ڈیڑھ سیر۔ ترکاری مہنگی۔

موسم سرما میں ایک دن

دھوپ میں بیٹھا ہوں۔ یوسف علی خاں اور لالہ ہیرا سنگھ بیٹھے ہیں۔ کھانا تیار ہے۔ خط لکھ کر بند کر کر آدمی کو دونگا اور میں گھر میں جاؤں گا۔ وہاں ایک دالان میں دھوپ آتی ہے۔ اس میں بیٹھوں گا۔ ہاتھ منہ دھوؤں گا۔ ایک روٹی کا چھلکا سالن میں بھگو کر کھاؤنگا بیسن سے ہاتھ دھوؤں گا۔ باہر آؤں گا[4]۔

---

[1] اردوئے معلیٰ صفحہ ۲۸۳۔ [2] اردوئے معلیٰ صفحہ ۱۵۸۔ [3] اردوئے معلیٰ صفحہ ۱۸۲۔ [4] اردوئے معلیٰ صفحہ ۱۲۰۔

جام تہی

جاڑا پڑ رہا ہے۔ ہمارے پاس شراب آج کی اور ہے۔ کل سے رات کو نری انگیٹھی پر گذارا ہے۔ بوتل گلاس موقوف[۱]

آج دوشنبہ ۳۱ جنوری ۱۸۵۹ء کی ہے۔ پہر دن چڑھا ہو گا کہ ابر گھر رہا ہے۔ ترشح ہو رہا ہے۔ ہوا سرد چل رہی ہے۔ پینے کو کچھ میسّر نہیں۔ ناچار روٹی کھائی ہے۔ شعر

افق ہا پُر از ابر بہمن مہی
سفالینہ جام من از مے تہی[۲]

---

[۱] اردوئے معلیٰ صفحہ ۱۲۸۔ [۲] اردوئے معلیٰ صفحہ ۲۷۷۔

چھٹا باب[۶]

غالب کا شمار باغیوں میں

سنہ ۱۸۶۰ء میں لارڈ صاحب بہادر نے میرٹھ میں دربار کیا۔ صاحب کمشنر بہادر دہلی اہالی دہلی کو ساتھ لیگئے۔ میں نے کہا "میں بھی چلوں" فرمایا کہ "نہیں" جب لشکر میرٹھ سے دلی میں آیا میں اپنے دستور کے موافق روزِ ورود لشکر میں گیا۔[۵] میر منشی سے ملا۔ اُن کے خیمہ میں بیٹھکر صاحب سکرٹر بہادر کو اطلاع کروائی۔ چپراسی کے ساتھ کلو بھی گیا تھا جواب آیا کہ ہمارا اسلام دو اور کہو کہ "فرصت نہیں ہے۔" خیر میں اپنے گھر آیا۔ کل پھر گیا۔ خبر کروائی۔ حکم ہوا کہ "غدر کے زمانے میں تم باغیوں کی خوشامد کرتے رہتے تھے۔ اب ہم سے ملنا کیوں مانگتے ہو؟" عالم نظر میں تیرہ و تار ہو گیا یہ پیام نومیدی جاوید ہے۔[۲] اُس دن چلا آیا۔ دوسرے دن میں نے انگریزی خط ان کے نام لکھوا کر ان کو بھیجا۔ مضمون یہ کہ باغیوں سے میرا اخلاص مظنہ محض ہے۔ امیدوار ہوں کہ اس کی تحقیقات ہو تاکہ میری صفائی

صفائی کی التجا

اور بے گناہی ثابت ہو۔ یہاں کے مقامات پر جواب نہ ہوا۔ اب ماہ گزشتہ یعنی فروری میں پنجاب کے ملک سے جواب آیا کہ

---

[۱] اُردوئے معلی صفحہ ۲۳۲۔ [۲] اردوئے معلی صفحہ ۲۷۱۔

تحقیقات سے انکار

لارڈ صاحب بہادر فرماتے ہیں کہ "ہم تحقیقات نہ کریں گے" بس یہ مقدمہ طے ہوا[۱]۔ میں گدائے مبرم اس حکم پر ممنوع نہ ہوا۔ جب لارڈ صاحب بہادر کلکتہ پہونچے۔ میں نے قصیدہ حسب معمول قدیم بھیجا مع اس حکم کے واپس آیا کہ "اب یہ چیزیں ہمارے پاس نہ بھیجا کرو۔ میں مایوس مطلق ہو کر بیٹھ رہا اور حکام شہر سے ملنا ترک کیا[۲]۔

کامیابی کی اُمید

نواب لفٹنٹ گورنر پنجاب دلّی آئے۔ اہالی شہر صاحب ڈپٹی کمشنر بہادر صاحب کے پاس دوڑے اور اپنے نام لکھوائے میں تو بیگانہ محض اور مطرود حکام تھا۔ جگہ سے نہ ہلا نہ کسی سے ملا۔ دربار ہوا ہر ایک کامگار ہوا۔ شنبہ آٹھویں فروری کو آزادانہ منشی من پھول سنگھ صاحب کے خیمے میں چلا گیا۔ اپنے نام کا ٹکٹ صاحب سکرٹر بہادر کے پاس بھیجا۔ بلایا گیا مہربان پاکر نواب صاحب کی ملازمت کی استدعا کی وہ بھی حاصل ہوئی۔ دو حاکم جلیل القدر کی وہ عنایتیں دیکھیں جو میرے تصور میں بھی نہ تھیں۔ (جملہ معترضہ) میر منشی لفٹنٹ گورنر سے سابقہ تعارف نہ تھا۔ وہ بطریق حسنِ طلب میرے خواہاں ہوئے تو میں گیا۔ جب حکام بمجرد استدعا مجھ سے بے تکلف ملے تو میں قیاس کر سکتا ہوں کہ میر منشی کی طرف سے حسن طلب بہ اشارہ حکام ہوگی[۳]۔

سانڈرس سے ملاقات

جناب سانڈرس صاحب بہادر نے مجھ کو بلایا۔ پنجشنبہ ۲۴ فروری کو میں گیا۔ صاحب شکار کو سوار ہو گئے تھے

---

[۱] اردوئے معلی صفحہ ۲۳۴۔ [۲] اردوئے معلی صفحہ ۲۳۲۔ [۳] اردوئے معلی صفحہ ۲۳۲۔

میں اُلٹا پھر آیا۔ جمعہ ۲۵ر فروری کو گیا ملاقات ہوئی۔ کرسی دی۔ بعد پرسشِ مزاج کے ایک خط انگریزی چار ورق کا اٹھا کر پڑھتے رہے۔ جب پڑھ چکے تو مجھ سے کہا کہ یہ خط ہے مکلوڈ صاحب حاکم صدر بورڈ پنجاب کا۔ تمہارے باب میں لکھتے ہیں کہ ان کا حال دریافت کر کے لکھو سو ہم تم سے پوچھتے ہیں کہ تم ملکۂ معظمہ سے خلعت کیا مانگتے ہو۔" حقیقت کہی گئی۔ ایک کاغذ آمدہ ولایت لے گیا تھا۔ وہ پڑھوا دیا۔ پھر پوچھا "تم نے کتاب کیسی لکھی ہے" اس کی حقیقت بیان کی۔ کہا۔" ایک مکلوڈ صاحب نے دیکھنے کو مانگی ہے اور ایک ہم کو دو۔" میں نے عرض کیا "کل حاضر کردں گا۔" پھر پنشن کا حال پوچھا۔ وہ بھی گذارش کیا اپنے گھر آیا اور خوش آیا۔ غرضکہ دوسرے دن یکشنبہ یوم تعطیل تھا۔ میں اپنے گھر رہا۔ دوشنبہ ۲۸ر فروری کو گیا۔ باہر کمرے میں بیٹھ کر اطلاع کروائی۔ کہا۔" اچھا توقف کرو" بعد تھوڑی دیر کے گڈ کپتان کی چھٹی آئی۔ سواری مانگی۔ جب سواری آ گئی۔ باہر نکلے میں نے کہا "وہ کتابیں حاضر ہیں۔" کہا "منشی جیون لال کو دے جاؤ۔" وہ اُدھر سوار ہو گئے۔ میں ادھر سوار ہو کر اپنے مکان پر آیا۔ سہ شنبہ یکم مارچ کو پھر گیا بہت التفات سے باتیں کرتے رہے۔ کچھ سارٹیفیکٹ گورنروں کے نام کے لے گیا تھا وہ دیکر یہ استدعا کی کہ "کتاب کے ساتھ یہ بھی بھیجا جائے۔" "بہت اچھا" کہکر رکھ لیا۔ پھر مجھ سے کہا کہ "ہم نے تمہاری پنشن کے باب میں اجرٹن صاحب بہادر جیسا کہ تم کو معلوم تھا گئے ہوئے تھے۔ کل وہ آئے۔ آج میں نے ان کو خط لکھا ہے جیسا وہ حکم دیں گے اس کے موافق عمل کروں گا۔ جب بلائیں گے تب جاؤں گا۔" دیکھو اسد اللہ الغالب علیہ السلام کی مدد کو کہ اپنے غلام کو کس طرح سے بچایا۔

۲۲ مہینے تک بھوکا پیاسا بھی نہ رہنے دیا۔ پھر کس محکمے سے کہ وہ آج سلطنت کا دھندہ ہے ملی۔ صبر و ثبات بھی اُسی کا بخشا ہوا تھا۔ میں کیا اپنے باپ کے گھر سے لایا تھا[1]

دربار و خلعت کے بحال ہونے کی نوید

بقیہ روداد یہ ہے کہ شنبہ دوم مارچ کو سوادِ شہر مخیم قیام گورنری ہوا۔ آخر روز میں اپنے شفیق قدیم جناب مولوی اظہار حسین خاں بہادر کے پاس گیا۔ اثنائے گفتگو میں فرمایا کہ "تمہارا دربار و خلعت بدستور بحال و برقرار ہے۔" متحیّرانہ میں نے پوچھا کہ "حضرت کیونکر؟" حضرت نے کہا کہ "حاکم حال نے ولایت سے آکر تمہارے علاقہ کے سب کاغذ انگریزی و فارسی دیکھے اور باجلاس حکم لکھوایا کہ اسداللہ خاں کا دربار اور خلعت بدستور بحال و برقرار رہے۔" میں نے پوچھا کہ "حضرت یہ امر کس اصل پر متفرع ہوا؟" فرمایا کہ "ہم کو کچھ معلوم نہیں۔ بس اتنا جانتے ہیں کہ یہ حکم دفتر میں لکھوا کر ۱۴ دن یا ۱۵ دن بعد ادھر کو روانہ ہوئے ہیں۔" میں نے کہا سبحان اللہ۔[2] شعر

کارسازِ ما بفکرِ کارِ ما
فکرِ ما در کارِ ما آزارِ ما

گورنر سے ملاقات۔ خلعت و دربار کھل گیا

سہ شنبہ ۳ مارچ کو بارہ بجے[3] چپراسی آیا اور کہا کہ "نواب لفٹنٹ گورنر نے یاد

---

[1] اُردوئے معلیٰ صفحہ ۲۳۳۔ [2] اُردوئے معلیٰ صفحہ ۲۳۳۔ [3] اُردوئے معلیٰ۔

کیا ہے" ...... میرا حال یہ ہے کہ علاوہ اس داہنے ہاتھ کے زخم کے سیدھی
ران میں اور بائیں ہاتھ میں ایک ایک پھوڑا جدا ہے ...... اٹھنا دشوار ہے
بہر حال سوار ہوگیا۔ پہلے سکرٹر سے ملا۔ پھر نواب صاحب کی خدمت میں
حاضر ہوا۔ تصوّر میں کیا بلکہ تمنّا میں بھی جو بات نہ تھی وہ حاصل ہوئی یعنی
عنایت سی عنایت اخلاق سے اخلاق وقت رخصت خلعت دیا اور فرمایا
کہ "ہم تجھ کو اپنی طرف سے ازراہِ محبت دیتے ہیں اور مژدہ دیتے ہیں کہ لارڈ
صاحب کے دربار میں تیرا نمبر اور خلعت کھل گیا۔ انبالہ جا دربار میں شریک ہو
خلعت پہن"۔ عرض حال کیا گیا۔ فرمایا "خیر اور کبھی کے دربار میں شریک ہو"
اس پھوڑے کا برا ہو انبالہ نہ جا سکا[1]۔ لارڈ صاحب بہادر کا حکم سن لیا۔ نہال
ہوگیا ...... جیتا رہا تو اور دربار میں کامیاب ہو رہوں گا؎

کارِ دُنیا کسے تمام نہ کرد
ہر چہ گیرید مختصر گیرید[2]

زر مجتمع ملنے کی رپورٹ

میری پنشن اور ولایت کے انعام کا حال کما حقہٗ سمجھ لو ع
دلا رحمٰن الطاف خفیہ۔ ایک طرزِ خاص پر تحریک ہوئی
نواب گورنر جنرل بہادر نے حاکم پنجاب کو لکھا کہ حاکم دہلی سے فلاں شخص کی
پنشن کے کل چڑھے ہوئے روپے کے یکمشت پانے کی اور آئندہ ماہ بماہ ملنے کی
رپورٹ منگوا کر اپنی منظوری لکھ کر ہمارے پاس بھیجدو تا کہ ہم منظوری دیگر تمہارے

---

[1] اردوئے معلی صفحہ ۳۱۳۔ [2] اردوئے معلی صفحہ ۲۳۳

پاس بھیج دیں سو یہاں اس کی تعمیل بطرز مناسب ہو گئی۔ کم و بیش دو مہینے میں سب روپیہ مل جائے گا۔ اور ہاں صاحب کمشنر بہادر نے یہ بھی کہا کہ "اگر تم کو ضرورت ہو تو سو روپیہ خزانہ سے منگوالو۔" میں نے کہا "صاحب یہ کیسی بات ہے کہ اوروں کو برس دن کا روپیہ ملا اور مجھے سو روپیہ دلواتے ہو۔" فرمایا کہ "تم کو اب چند روز میں سب روپیہ اور اجرا کا حکم مل جائے گا اوروں کو یہ بات برسوں میں میسر آئے۔" میں چپ ہو رہا۔ آج دوشنبہ یکم شعبان اور ہفتم مارچ ہے۔ دوپہر ہو جائے تو اپنا آدمی مع رسید بھیجکر روپیہ منگالوں پر یاروں ولایت کے انعام کی توقع خدا ہی سے ہے۔ حکم تو اسی حکم کے ساتھ رپورٹ کرنے کا بھی آیا مگر یہ حکم ہے کہ اپنی رائے لکھو۔ اب دیکھیے یہ دو حاکم یعنی حاکم دہلی اور حاکم پنجاب اپنی رائے کیا لکھتے ہیں۔[1]

پنشن کا اجرا۔ زر مجتمع ملا

پنشن بے کم و کاست جاری ہوا۔ زر مجتمع سہ سالہ یکمشت مل گیا۔ تین برس کے دو ہزار دو سو پچاس روپے ہوئے سو (۱۰۰) مد خرچ جو پائے تھے وہ کٹ گئے۔ ڈیڑھ سو متفرقات میں اٹھ گئے مختار کار دو ہزار لایا۔ چونکہ میں اس کا قرضدار ہوں روپیہ اس نے اپنے گھر میں رکھے اور مجھ سے کہا کہ "میرا حساب کیجیے۔" حساب کیا۔ سود مول سات

قرض کی ادائیگی

کم پندرہ سو روپیہ نکلے۔ میں کہتا ہوں "یہ گیارہ سو بانٹ دے نو سو بچے۔ آدھے تو لے۔ آدھے مجھے دے۔" وہ کہتا ہے

---

[1] اردوئے معلیٰ صفحہ ۱۵۳۔ [2] اردوئے معلیٰ صفحہ ۳۲۸۔

"پندرہ سو مجھ کو دو پانسو سات تم لو" یہ جھگڑا مٹ جائے گا تب کچھ ہاتھ آئے گا خزانہ سے روپیہ آگیا ہے۔ میں نے آنکھوں سے دیکھا ہو تو آنکھیں پھوٹیں۔ بات رہ گئی۔ پت رہ گئی۔ حاسدوں کو موت آگئی۔ دوست شاد ہو گئے۔ میں جیسا ننگا بھوکا ہوں جب تک جیوں گا ایسا ہی رہوں گا۔[۱] بیدل کا شعر مجھ کو مزا دیتا ہے[۲]

نہ شام مارا سحر نویدی نہ صبح مارا دم سپیدی
چو حاصل ماست نا امیدی غبار دنیا بفرق عقبیٰ

پنشن بطریق شش ماہی

آخر جون میں صدر پنجاب سے حکم آگیا کہ پنشن داران ماہ بماہ نہ پائیں۔ سال میں دو بار بطریق شش ماہی فصل بہ فصل پایا کریں۔ ناچار ساہوکار سے سود کاٹ کر روپیہ لیا گیا۔۔۔۔ یہ سود چھ مہینہ تک اسی طرح کٹوا دینا پڑے گا۔ ایک رقم معقول گھاٹے میں جائے گی[۳]

رسم ہے مردہ کی چھ ماہی ایک
خلق کا ہے اسی چلن پہ مدار
مجھ کو دیکھو کہ ہیں بقید حیات
اور چھ ماہی ہو سال میں دو بار

---

[۱] اردوئے معلی صفحہ ۴۹۔ [۲] اردوئے معلی صفحہ ۱۸۴۔ [۳] اردوئے معلی صفحہ ۵۶۔

ساتواں باب (۷)

نواب یوسف علی خاں والیٔ رامپور

نواب یوسف علی خاں بہادر والیٔ رامپور کہ میرے آشنائے قدیم ہیں یعنی اس سال یعنی ۱۸۵۵ء میں میرے شاگرد ہوئے۔ ناظم ان کو تخلص دیا گیا۔ بیس پچیس غزلیں اُردو کی بھیجتے اصلاح دیکر بھیجدیتا۔ گاہ گاہ کچھ روپیہ ادھر آتا رہتا۔ قلعہ کی تنخواہ جاری۔ انگریزی پنشن کھلی ہوئی۔ ان کی عطایا فتوح گنے جاتے تھے۔ جب

نواب کی استاد پروری

وہ دونوں تنخواہیں جاتی رہیں تو زندگی کا مدار اُن کے عطیہ پر رہا۔ بعد فتح دہلی وہ ہمیشہ میرے مقدم کے خواہاں رہتے تھے۔ میں عذر کرتا تھا۔ جب جنوری ۱۸۶۰ء میں گورنمنٹ سے وہ جواب پایا کہ جو اُوپر لکھ آیا ہوں تو میں آخر جنوری میں رامپور گیا۔ چھ سات ہفتہ وہاں رہ کر دلی آیا۔[۱]

رامپور کا سفر

میں نے دلی کو چھوڑا اور رامپور چلا۔ پنجشنبہ ۱۹ر کو مرادنگر اور جمعہ ۲۰ر کو میرٹھ پہونچا۔ آج شنبہ ۲۱ر کو بھائی مصطفے خاں کے یہاں قیام کیا۔ کل شاہجہاں آباد پرسوں گدھ مکٹیسر رہوں گا۔ پھر مراد آباد ہوتا ہوا رامپور جاؤں گا۔[۲]

---

[۱] اُردوئے معلے صفحہ ۲۳۴۔ [۲] اُردوئے معلے صفحہ ۶۵

شہر میں افواہیں

میاں میں جو آخر جنوری کو رامپور جا کر آخر مارچ میں یہاں آ گیا ہوں تو کیا کہوں کہ یہاں کے لوگ میرے حق میں کیا کچھ کہتے ہیں۔ ایک گروہ کا قول ہے کہ یہ شخص والیٔ رامپور کا استاد تھا اور وہاں گیا تھا۔ اگر نواب نے کچھ سلوک نہ کیا ہوگا تو بھی پانچ ہزار روپے سے کم نہ دیا ہوگا۔ ایک جماعت کہتی ہے کہ نوکری کو گئے تھے مگر نوکر نہ رکھا۔ ایک فرقہ کہتا ہے کہ نواب نے نوکر رکھ لیا تھا۔ دو سو روپیہ مہینہ کر دیا تھا۔ نواب لفٹنٹ گورنر الہ آباد جو رامپور آئے اور ان کو غالبؔ کا وہاں ہونا معلوم ہوا تو انھوں نے نواب صاحب سے کہا "اگر ہماری خوشنودی چاہتے ہو تو اس کو جواب دو۔ نواب صاحب نے برطرف کر دیا یہ تو سب سن لیا اصل حقیقت سنو۔ نواب یوسف علی خاں بہادر تیس بتیس برس کے میرے دوست اور پانچ چھ برس سے شاگرد ہیں۔ آگے گاہ گاہ کچھ بھیج دیا کرتے تھے۔ اب جولائی ۱۸۵۹ء سے سو روپیہ ماہ بماہ بھیجتے ہیں۔ بلاتے

تنخواہ کا تقرر

رہتے ہیں۔ اب میں گیا دو مہینے رہ کر چلا آیا۔ لڑکوں کو ساتھ لے گیا تھا۔ وہاں انھوں نے میرا ناک میں دم کر دیا۔ تنہا بھیج دینے میں وہم آیا کہ خدا جانے اگر کوئی امر حادث ہو تو بدنامی عمر بھر رہے۔ اس سبب سے جلد چلا آیا ورنہ گرمی برسات وہاں کاٹتا۔ اب بہ شرط حیات جریدہ بعد برسات جاؤں گا اور بہت دن تک یہاں نہ آؤں گا۔ قرارداد یہ ہے کہ نواب صاحب جولائی ۱۸۵۹ء سے کہ جس کو یہ دسواں مہینہ ہے سو روپے

لہ اردوئے معلے صفحہ ۱۳۹۔

مجھے ماہ بماہ بھیجتے ہیں اب جو میں وہاں گیا تو دو سو روپیہ مہینہ پاؤں اور دلّی رہوں تو سَو روپے۔

نواب صاحب کا برتاؤ

بھائی سو دو سو میں کلام نہیں۔ کلام اس میں ہے کہ نواب صاحب دوستانہ و شاگردانہ دیتے ہیں۔ مجھکو نوکر نہیں سمجھتے ہیں۔ ملاقات بھی دوستانہ رہی۔ معانقہ و تعظیم جس طرح احباب میں رسم ہے وہ صورت ملاقات کی ہے۔ لڑکوں سے میں نے نذر دلوائی تھی۔ بس بہر حال غنیمت ہے۔ رزق کے اچھی طرح ملنے کا شکر چاہیئے۔ کمی کا شکوہ کیا[1]

دلی سے رامپور کو روانگی۔ دوسرا سفر

رام پور کی سرکار کا فقیر تکیہ دار و روزینہ خوار ہے رئیس حال (نواب کلب علی خاں) نے مسند نشینی کا جشن کیا۔ دعاگوئے دولت کو درِ دولت پر جانا واجب ہوا۔ ہفتم اکتوبر کو دلّی سے رامپور روانہ ہوا[2]

غازی آباد سے روانگی

ہفتہ کے دن دو تین گھڑی دن چڑھے احباب کو رخصت کر کے راہی ہوا۔ مقصد یہ تھا کہ پلکھوے رہوں۔ وہاں قافلے کی گنجائش نہ پائی۔ ہاپوڑ کو روانہ ہوا۔ دونوں برخوردار گھوڑوں پر سوار پہلے چل دیئے۔ چار گھڑی دن رہے میں ہاپوڑ کی سرا میں پہونچا۔ دونوں بھائیوں کو بیٹھے ہوئے اور گھوڑوں کو ٹہلتے پایا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں نے چھٹانک بھر

---

[1] اردوئے معلیٰ صفحہ ۱۲۷۔ [2] اردوئے معلیٰ صفحہ ۱۹۹۔

گھی داغ کیا۔ دو شامی کباب اس میں ڈال دیئے۔ رات ہو گئی تھی شراب پی لی۔ کباب کھا لیئے۔ لڑکوں نے ادہر کی کھچڑی پکوائی اور خوب گھی ڈال کر آپ بھی کھائی اور سب آدمیوں کو کھلائی۔ دن کے واسطے سادہ سالن پکوایا۔ ترکاری نہ ڈلوائی۔

مراد آباد پہونچنا

بُدھ کا دن پہر بھر چڑھا ہو گا کہ میں فقط پالکی پر مُراد آباد پہونچا۔ ۲۰ جمادی الاول کی اور ۱۱ اکتوبر کی ہے۔ دونوں لڑکے گاڑیاں اور رتھ اور آدمی سب پیچھے ہیں۔ اب آئے جاتے ہیں۔ رات بخیر گذری بشرط حیات رامپور پہونچ جائیں گے۔[۱]

رامپور کی تعریف

یہ رامپور ہے۔ دارالسرور ہے جو لطف یہاں ہے وہ اور کہاں ہے۔ پانی سبحان اللہ۔ شہر سے تین سو قدم پر ایک دریا ہے اور کوسی اس کا نام ہے۔ بے شبہ چشمۂ آب حیات کی کوئی سوت اس میں ملی ہے۔ خیر اگر یوں بھی ہے تو بھائی آب حیات عمر بڑھاتا ہے لیکن اتنا شیریں کہاں ہو گا۔[۲] خدا کی قسم میں یہاں خوش ہوں اور تندرست ہوں۔[۳]

مہماں نوازی

ایک مکان کہ وہ تین چار مکانوں پر مشتمل ہے رہنے کو ملا ہے۔[۴] دن کا کھانا ایسے وقت آتا ہے کہ پہر دن چڑھے تک میرے آدمی بھی روٹی کھا چکتے ہیں۔ شام کا کھانا بھی سویرے آتا ہے۔ کئی طرح کے سالن پلاؤ۔ متنجن۔ پسندے۔ دونوں وقت روٹیاں خمیری۔ چپاتیاں۔ مُربے۔

۱؎ اُردوئے معلی صفحہ ۱۹۰۔ ۲؎ اُردوئے معلی صفحہ ۱۳۳۔ ۳؎ اُردوئے معلی صفحہ ۱۷۸۔ ۴؎ ایضاً ۱۷۸۔

اچار۔ میں بھی خوش۔ لڑکے بھی خوش۔ کلّو اچھا ہو گیا ہے۔ سقّہ۔ مشعلچی۔ خاکروب سرکار سے متعین ہے حجام اور دھوبی نوکر رکھ لیا ہے۔ آج تک دو ملاقاتیں ہوئی ہیں[۱]

تعظیم۔ تواضع۔ اخلاق کسی بات میں کمی نہیں۔ ہنوز کچھ گفتگو درمیان نہیں۔ میں خود اُن سے ابتدا کروں گا۔ وہ بھی مجھ سے بالمشافہ نہ کہیں گے مگر بواسطہ کارپردازان سرکار دیکھوں مجھ سے کیا کہتے ہیں اور کیا مقرر کرتے ہیں۔ میں سمجھتا تھا کہ میرے پہونچنے کے بعد جلد کوئی صورت قرار پائے گی لیکن آج تک کہ جمعہ آٹھواں دن میرے پہونچنے کو ہے کوئی کلام نہیں ہوا۔[۲]

نواب کی مدح

میں نثر کی داد اور نظم کا صلہ مانگنے نہیں آیا۔ بھیک مانگنے آیا ہوں۔ روٹی اپنی گرہ سے نہیں کھاتا۔ سرکار سے ملتی ہے۔[۳] وقت رخصت میری قسمت اور منعم کی ہمت۔ نواب صاحب ازروئے صورت رُوح مجسّم اور باعتبار اخلاق آیت رحمت ہیں۔ خزانہ فیض کے تحویلدار ہیں جو شخص دفتر ازل سے جو کچھ لکھوا لایا ہے اس کے ملنے میں دیر نہیں لگتی۔[۴] حلیم و خلیق۔ باذل کریم۔ متواضع۔ متشرع۔ متورع۔ شعر فہم۔ سیکڑوں شعر یاد۔ نظم کی طرف توجہ نہیں۔ نثر لکھتے ہیں اور خوب لکھتے ہیں۔ جلالائے طباطبائی کی طرز پر ستے ہیں۔ شگفتہ جبیں ایسے کہ ان کے دیکھنے سے غم کوسوں بھاگ جائے فصیح بیان ایسے کہ ان کی تقریر سُن کر نئی روح قالب میں آئے۔[۵]

---

[۱] اُردوئے معلیٰ صفحہ ۱۷۸۔ [۲] اُردوئے معلیٰ صفحہ ۱۸۶۔ [۳] اُردوئے معلیٰ صفحہ ۷۵۔
[۴] اُردوئے معلیٰ۔ [۵] اُردوئے معلیٰ صفحہ ۳۵۹۔

واپسی۔ حالات سفر

بعد اختتام بزم عازم وطن ہوا۔[1] مُراد آباد پہونچا۔ بعد پالکی کے اوترلنے کے پُل کا ٹوٹ جانا۔ گاڑی۔ اسباب۔ یہانتک کہ رختِ خواب کا مع آدمیوں کے اس زمہریر کے میدان میں رہنا۔ بغیر جاڑے کے کچھ نہ کھانا۔ خیر جو اُن پر گذری وہ جانیں۔ میں مراد آباد کی سرا میں ایک چھوٹی سی حویلی میں ٹھہرا۔ بھوکا۔ پیاسا۔ کمل اوڑھ کر پڑ رہا۔ یہ شعر اپنا پڑھ پڑھ کر صبح کی ؂

گرم فریاد رکھا شکل نہالی نے مجھے

تب اماں ہجر نے دی بردِ لیالی نے مجھے

صبح کو خستہ و رنجور اُٹھا۔ صاحبزادہ ممتاز علی خاں بہادر کے بھیجے ہوئے دو فرشتے آئے۔ اٹھا کر سعید الدین خاں صاحب کے ہاں لیگئے۔ صاحبزادہ صاحب نے وہ تعظیم و تکریم کی کہ میری ارزش سے زیادہ تھی۔ ناگاہ مولوی محمد حسن خاں بہادر صدر الصدور آئے اور مجھے اپنے گھر لے گئے۔ پانچ دن وہاں رہا۔ بھائی نواب مصطفیٰ خاں بہادر وہیں مجھ سے آکر ملے۔ دوسرے دن وہ رہگزاری دار السرور رامپور اور میں جادہ نورد ستم آباد دہلی ہوا۔ دوشنبہ ۲۰ شعبان ۱۲۸۲ھ ۸ جنوری ۱۸۶۶ء در غمکدہ پر پہونچا۔ حضور (نواب کلب علی خاں) کے اقبال کی تائید تھی ورنہ میں اور جیتا دلی پہونچتا۔[2] ؂

مغلوب غلبۂ غمِ دل غالبِ حزیں | کاندر تنش ز ضعف تواں گفت جاں نبود
از رامپور زندہ بہ دہلی رسیدہ است | مار ازیں گیاہ ضعیف ایں گماں نبود

---

[1] اُردوئے معلیٰ صفحہ ۱۹۹۔ [2] مکاتیبِ غالب صفحہ ۶۷۔

آٹھواں باب (۸)

مذہب

میں موحد خالص اور مومن کامل ہوں۔ زبان سے لا الہ الا اللہ کہتا ہوں اور دل میں لاموجود الا اللہ لاموثر فی الوجود الا اللہ سمجھے ہوا ہوں۔ انبیا سب واجب التعظیم اور اپنے اپنے وقت میں سب مفترض الطاعت تھے۔ محمد علیہ السلام پر نبوت ختم ہوئی۔ یہ خاتم المرسلین اور رحمۃ اللعالمین ہیں مقطع نبوت کا مطلع امامت اور امامت نہ اجماعی بلکہ من اللہ ہے اور امام من اللہ علی علیہ السلام ہیں ثم حسنؑ ثم حسینؑ اسی طرح تا مہدی موعود علیہ السلام

ع زیستم ہم بریں بگزرم۔ ہاں اتنی بات اور ہے کہ اباحت اور زندقہ کو مردود اور شراب کو حرام اور اپنے کو عاصی سمجھتا ہوں۔ اگر مجھ کو دوزخ میں ڈالیں گے تو میرا جلانا مقصود نہ ہو گا بلکہ میں دوزخ کا ایندھن ہوں گا اور دوزخ کی آنچ کو تیز کر دوں گا تاکہ منکرین و مشرکین نبوت مصطفویؐ اور امامت مرتضویؑ اس میں جلیں[1]۔

اثنائے عشری

صاحب بندہ اثنائے عشری ہوں۔ ہر مطلب کے خاتمہ پر بارہ کا ہندسہ لکھا کرتا ہوں۔ خدا کرے کہ میرا خاتمہ اسی عقیدہ پر ہو[2]۔

---

[1] اردوئے معلیٰ صفحہ ۳۶۲۔ [2] اردوئے معلیٰ صفحہ ۲۱۱۔

اعتراف: اگرچہ فاسق و فاجر ہوں مگر وحدانیت خدا اور نبوت خاتم الانبیا کا بدل معتقد اور بزبان معترف ہوں[۱]

مرید ہونا: شاہ محمد اعظم صاحب ..... خلیفہ تھے مولوی فخر الدین صاحب کے اور میں مرید ہوں اس خاندان کا[۲]۔ اگر منظور کیجیے تو میں صوفی ہوں ہمہ اوست کا دم بھرتا ہوں۔ بموجب مصرع کے۔ ع

دل بدست آور کہ حج اکبرست[۳]

یہاں لاموجود الا اللہ کی بادہ ناب کا رطل گراں چڑھائے ہوئے اور کفر و اسلام و نور و نار کو مٹائے ہوئے بیٹھے ہیں۔ شعر

کجا غیر و کو غیر و کو نقش غیر

سوائے اللہ واللہ ما فی الوجود

بنی آدم سے محبت: میں تو بنی آدم کو مسلمان یا ہندو یا نصرانی عزیز رکھتا ہوں اور اپنا بھائی گنتا ہوں۔ دوسرا مانے یا نہ مانے[۴]

۱؎ مکاتیب غالب صفحہ ۸۳۔ ۲؎ اردوئے معلی صفحہ ۱۳۶۔ ۳؎ اردوئے معلی صفحہ ۱۱۹
۴؎ اردوئے معلی صفحہ ۴۲۔

نواں باب (۹)

آم سے رغبت

آم مجھ کو بہت مرغوب ہیں انگور سے کم عزیز نہیں[۱]۔ یہ ثمر رب النوع اثمار ہے۔ اس کی تعریف کیا کروں[۲]۔ رامپور سے نواب صاحب اپنے باغ کے آموں میں سے اکثر بہ سبیل ارمغاں بھیجے رہتے ہیں اسے لو آج بریلی سے ایک بہنگی ایک دوست کی بھیجی ہوئی آئی ہے۔ دو ٹوکرے ہر ٹوکرے میں سو آم۔ کلو داروغہ نے میرے سامنے وہ ٹوکرے کھولے۔ دو سو میں سے تراسی آم اچھے نکلے اور ایک سو سترہ آم بالکل سڑے ہوئے[۳]۔

آموں کا آنا

دو ایک آدمی آ گئے۔ دن بھی تھوڑا رہ گیا..... باہر تختوں پر آبیٹھا شام ہوئی۔ چراغ روشن ہوا۔ منشی سید احمد حسین سرہانے کی طرف مونڈھے پہ بیٹھے ہیں۔ میں پلنگ پر لیٹا ہوا ہوں کہ ناگاہ چشم و چراغ دودمان علم و یقین سید نصیر الدین آیا۔ ایک کوڑا ہاتھ میں اور ایک آدمی ساتھ اس کے سر پہ ایک ٹوکرا۔ اس پر گھاس ہری بچھی ہوئی۔ میں نے کہا اہاہا سلطان العلما مولانا سرفراز حسین دہلوی نے دوبارہ رسید بھیجی ہے۔ بارے معلوم ہوا کہ وہ نہیں ہے۔ یہ کچھ اور ہی فیض خاص نہیں لطف عام ہے۔ شراب نہیں آم

---

[۱] اردوئے معلی صفحہ ۱۹۔ [۲] اردوئے معلی صفحہ ۱۷۲۔ [۳] اردوئے معلی صفحہ ۱۹۔

ہے۔ خیر یہ خطبہ بھی بے خلل ہے بلکہ نعم البدل ہے۔ ایک ایک آم کو سربمہر گلاس سمجھا۔ بادۂ انگوری سے بھرا ہوا اگر واہ کس حکمت سے بھرا ہے کہ ہنپیٹھ گلاس میں سے ایک قطرہ نہیں گرا ہے۔ میاں کہتا تھا یہ اسّی تھے۔ پندرہ بگڑ گئے بلکہ سڑ گئے۔ تا اس کی بُرائی اوروں میں سرایت نہ کرے ٹوکرے میں سے پھینکدیئے۔[1]

آم کھانے کا شوق

اُن دنوں میں کہ دل بھی تھا اور طاقت بھی تھی۔ شیخ محسن الدین مرحوم سے بطریق تمنّا کہا گیا تھا کہ جی یوں چاہتا ہے کہ برسات میں مارہرہ جاؤں اور دل کھول کر اور پیٹ بھر کر آم کھاؤں۔ اب وہ دل کہاں سے لاؤں۔ طاقت کہاں سے پاؤں۔ نہ آموں کی طرف وہ رغبت نہ معدے میں اتنی آموں کی گنجائش۔ نہار منہ میں آم نہ کھاتا تھا۔ کھانے کے بعد میں آم نہ کھاتا تھا۔ رات کو کچھ کھاتا ہی نہیں۔ جو کھاؤں بین الطعامین۔ ہاں آخر روز بعد ہضم معدہ آم کھانے بیٹھ جاتا تھا۔ بے تکلف عرض کرتا ہوں۔ اتنے آم کھاتا کہ پیٹ بھر جاتا تھا۔ اور دم پیٹ میں نہ سماتا تھا۔ اب بھی اسی وقت کھاتا ہوں مگر دس بارہ۔ اگر پیوندی آم بڑے ہوئے تو پانچ سات ؎

دریغا کہ عہد جوانی گذشت

جوانی مگو زندگانی گذشت[2]

شراب

دو قسم کی انگریزی شراب ایک تو کاسن ٹیلن اور ایک اوڈ ٹام۔ یہ میں ہمیشہ پیا کرتا تھا۔ اور یہ دونوں ہیں روپیہ حد چھبیس روپے

---

[1] اردوئے معلیٰ صفحہ ۱۵۷۔ [2] اردو کے معلیٰ صفحہ ۱۱۳۔

درجن آتی تھی۔ اب یہاں پہلے تو نظر ہی نہیں آتی تھی اب پچاس اور ساٹھ روپے درجن آتی ہے[1]۔ جاڑوں میں مجھ کو بہت تکلیف ہے اور یہ گڑ چاول کی شراب میں نہیں پیتا۔ یہ مجھ کو مضرت کرتی ہے۔ اور سب مجھے اس سے نفرت ہے[2]۔

فرنچ میں آدھا مسلمان کہ جو مذہب و ملت کے بندوں سے بھی آزاد ہوں اور اپنی بدنامی کا کلی غم نہیں رکھتا ہمیشہ سے عادی ہوں کہ رات کو سوائے "فرنچ" کے اور کچھ نہیں پیتا اور اگر وہ مجھ کو نہ ملی تو بات نہ کرتا۔ اس زمانہ میں کہ شراب بہت مہنگی ہے اور پیسہ پاس نہیں۔ اگرچہ انمرد خدا دوست خداشناس دریا دل مہیس داس بادہ شکری ہندی جو رنگ میں فرنچ کی سی ہے اور خوشبو میں اس سے اچھی بھیجکر میری دہکتی ہوئی آگ پر پانی نہ ڈالتا تو جان نہ بچتی اور جگر کی آگ میں بھن جاتا[3]۔

روز مسرت مولانا غالب علیہ الرحمہ ان دنوں میں بہت خوش ہیں۔ پچاس ساٹھ جزو کی کتاب امیر حمزہ کی داستان کی اور اسی قدر حجم کی جلد بوستان خیال کی آگئی ہے۔ سترہ بوتلیں بادہ ناب کی توشہ خانے میں موجود ہیں۔ دن بھر کتاب دیکھا کرتے ہیں۔ رات بھر شراب پیا کرتے ہیں۔

کسے کیں مرادش میسر بود
اگر جم نباشد سکندر بود[4]

---

[1] اردوئے معلی صفحہ ۳۱۴۔ [2] اردوئے معلی صفحہ ۳۱۵۔ [3] دستنبو صفحہ ۷۰، ۴۰۔ [4] اردوئے معلی ص ۱۳۱

محدود آمدنی

وہ زمانہ نہیں کہ ادھر متھرا داس سے قرض لیا ادھر درباری مل کو مارا ادھر خوب چند چین سکھ کی کوٹھی جا لوٹی ہر ایک پاس تمسک مہری موجود۔ شہد لگاؤ۔ چاٹو۔ نہ مول نہ سود۔ اس سے بڑھ کر یہ بات کہ روٹی کا خرچ بالکل پھوپھی کے سر باایں ہمہ کبھی خان نے کچھ دیدیا کبھی الور سے کچھ دلوا دیا۔ کبھی ماں نے کچھ آگرہ سے بھیجدیا۔ اب میں اور باسٹھ روپے آٹھ آنے کلکٹری کے سو روپے رامپور کے۔ قرض دینے والا ایک مختار کار۔ وہ سود ماہ بماہ لیا چاہے۔ مول میں قسط اس کو دینی پڑے۔ انکم ٹیکس جدا۔ چوکیدار جدا۔ سود جدا۔ مول جدا۔ بی بی جدا۔ بچے جدا۔ شاگرد جدا۔ آمد وہی ایک سو باسٹھ۔ تنگ آگیا۔ گذارہ مشکل ہو گیا۔ روزمرّہ کا کام بند رہنے لگا۔ سوچا کہ کیا کروں

اخراجات میں کمی

کہاں سے گنجائش نکالوں۔ قہر درویش برجان درویش۔ صبح کی تبرید متروک۔ چاشت کا گوشت آدھا۔ رات کی شراب و گلاب موقوف۔ بیس بائیس روپیہ بچا۔ روزمرّہ کا خرچ چلا۔ یاروں نے پوچھا "تبرید و شراب کب تک نہ پیوگے"۔ کہا گیا "جب تک وہ نہ پلائیں گے"۔ پوچھا "نہ پیوگے تو کس طرح جیوگے"۔ جواب دیا "جس طرح وہ جلائیں گے"۔

خرچ بدستور

بارے مہینہ پورا نہیں گذرا تھا کہ رامپور سے علاوہ وجہ مقرری اور روپیہ آگیا۔ قرض قسط ادا ہو گیا متفرق رہا۔ خیر ہو۔ صبح کی تبرید۔ رات کی شراب جاری ہو گئی۔ گوشت پورا آنے لگا۔[1]

---

[1] اردوئے معلیٰ صفحہ ۳۶۱۔

دسواں باب (۱۰)

رنج والم

آدمی کثرت غم سے سودائی ہو جاتے ہیں۔ عقل جاتی رہتی ہے۔ اگر ہجوم غم میں میری قوت متذکرہ میں فرق آگیا ہو تو کیا عجب بلکہ اس کا باور نہ کرنا غضب ہے۔ پوچھو کہ کیا غم ہے۔ غمِ مرگ۔ غمِ فراق۔ غمِ رزق۔ غمِ عزت۔ میں قلعہ نامبارک سے قطع نظر کرکے اہل شہر کو گنتا ہوں۔ مظفر الدولہ میر ناصر الدین، مرزا عاشور بیگ میرا بھانجہ۔ اس کا بیٹا احمد مرزا۔ انیس برس کا بچہ مصطفےٰ خاں ابن اعظم الدولہ اس کے دو بیٹے ارتضیٰ خاں اور مرتضیٰ خاں قاضی فیض اللہ کیا میں اپنے عزیزوں کے برابر نہیں چاہتا تھا۔ اے لو بھول گیا۔ حکیم رضی الدین خاں۔ میر احمد حسین میکش۔ اللہ اللہ ان کو کہاں سے لاؤں۔

غمِ فراق

غمِ فراق حسین مرزا، میر مہدی، میر سرفراز حسین، میرن صاحب خدا ان کو جیتا رکھے۔ کاش یہ ہوتا کہ جہاں ہوتے وہاں خوش ہوتے گھر ان کے بے چراغ وہ خود آوارہ۔ سجاد اور اکبر کے حال کا جب تصور کرتا ہوں کلیجہ ٹکڑے ٹکڑے ہوتا ہے۔ کہنے کو ہر کوئی ایسا کہہ سکتا ہے مگر میں علیؑ کو گواہ کرکے کہتا ہوں کہ ان اموات کے غم میں اور زندوں کے فراق میں عالم نظر میں تیرہ و تار ہے۔[1]

---

[1] اردوئے معلیٰ صفحہ ۲۰۳۔

دوستوں کی یاد

وہی بالاخانہ ہے اور وہی میں ہوں۔ سیڑھیوں پہ نظر ہے کہ وہ میر مہدی آئے، وہ میر سرفراز حسین آئے، وہ یوسف مرزا آئے وہ میرن آئے۔ وہ یوسف علی خاں آئے۔ مرے ہوؤں کا نام نہیں لیتا۔ بچھڑے ہوؤں میں کچھ گئے۔ اللہ اللہ۔ ہزاروں کا میں ماتم دار ہوں میں مروں گا تو مجھ کو کون روئے گا[1]

قتلِ احباب کا رنج

میاں میں کثیر الاحباب شخص ہوں۔ سیکڑوں بلکہ ہزاروں دوست اس باسٹھ برس میں مر گئے۔ خصوصاً اس فتنہ و آشوب میں تو شاید کوئی میرا جاننے والا نہ بچے گا۔ انگریزی قوم میں سے جوان روسیاہ

انگریز احباب

کالوں کے ہاتھ سے قتل ہوئے اس میں کوئی میرا امید گاہ تھا اور کوئی میرا شفیق اور کوئی میرا دوست اور کوئی میرا یار اور کوئی میرا شاگرد۔ ہندوستانیوں میں کچھ عزیز، کچھ دوست۔ کچھ شاگرد۔ کچھ معشوق

ہندوستانی احباب

سو وہ سب کے سب خاک میں مل گئے۔ ایک عزیز کا ماتم کتنا سخت ہوتا ہے جو اتنے عزیزوں کا ماتمدار ہو اس کو زیست کیونکر نہ دشوار ہو۔ ہائے اتنے یار مرے کہ جو اب میں مروں گا تو کوئی رونے والا بھی نہ ہوگا[2]

الکزنڈر ہدرلی

الکزنڈر ہدرلی مشتہر بہ الک صاحب مرگیا۔ واقعی بے تکلف وہ میرا عزیز اور ترقی خواہ اور راج میں اور مجھ میں متوسط تھا[3]

---

[1] اردوئے معلیٰ صفحہ ۱۱۹۔ [2] اردوئے معلیٰ صفحہ ۱۸۳۔ [3] اردوئے معلیٰ صفحہ ۹۶۔ [4] ایضاً ۱۴۹

میجر جان جاکوب

ہائے میجر جان جاکوب کیا جوان مارا گیا ہے۔ سچ اس کا یہ شیوہ تھا کہ اردو کی فکر کو مانع آتا اور فارسی زبان میں شعر کہنے کی رغبت دلواتا۔ یہ بھی انھیں میں سے ہے جن کا میں ماتمی ہوں۔ ہزارہا دوست مر گئے کس کو یاد کروں۔ کس سے فریاد کروں۔ جیوں تو کوئی غمخوار نہیں۔ مروں تو کوئی عزادار نہیں[1]

دوستوں کے لئے دعا

اس راہ سے جو مجھ کو دوست اب باقی ہیں سب عزیز ہیں واللہ دعا مانگتا ہوں کہ اب ان احباب میں سے کوئی میرے سامنے نہ مرے۔ کیا معنی کہ جو میں مروں تو کوئی میرا یاد کرنے والا بھی تو دنیا میں ہو[2]

ہرگوپال تفتہ

مجھ کو اس پر ناز ہے کہ میں ہندوستان میں ایک دوست صادق الولا رکھتا ہوں جس کا ہرگوپال نام اور تفتہ تخلص ہے[3]

منشی نول کشور

منشی نول کشور صاحب یہاں آئے تھے۔ مجھ سے ملے۔ بہت خوبصورت اور خوش سیرت، سعادت مند اور معقول پسند آدمی ہیں[4] ایک دن منشی صاحب میرے پاس بیٹھے تھے اور برخوردار شہاب الدین خاں بھی تھا۔ میں نے ثاقب کو مخاطب کر کے کہا کہ "اگر میں دنیا دار ہوتا تو اسکو نوکری کہتا مگر چونکہ فقیر تکیہ دار ہوں تو یہ کہہ سکتا ہوں کہ تین جگہ کا روزینہ دار ہوں۔ ساڑھے باسٹھ روپیہ یعنی لما صہ سال سرکار انگریزی سے پاتا ہوں اور بارہ سو

---

[1] اردوے معلی صفحہ ۲۰۴۔ [2] اردوے معلی صفحہ ۱۸۳۔ [3] اردوے اردوے معلی صفحہ ۷۶۔ [4] ایضا صفحہ ۱۷۳

روپیہ سال رامپور سے اور چوبیس روپیہ سال اِن مہاراج سے۔ توضیح یہ کہ یہ دو برس سے ہر مہینے میں چار بار اخبار مجھ کو بھیجتے ہیں قیمت نہیں لیتے مگر ہاں اڑتالیس ٹکٹ میں مطبع میں پہونچا دیتا ہوں[1]

شیو جی رام و بالمکند
شیو جی رام برہمن برہما تزاد سمجھدار جوان ہے اور میرے لئے بجائے فرزند کے ہے .... اس کا لڑکا بالمکند سیدھا اور پارسا نوجوان ہے۔ اپنے باپ کی طرح سے وہ بھی فرمانبرداری میں چست اور غم خواری میں یکتا ہے[2]

دو مخلص دوست
ستر برس کی عمر ہے۔ بے مبالغہ کہتا ہوں ستر ہزار آدمی نظر سے گذرے ہوں گے۔ زمرۂ خواص میں سے عوام کا شمار نہیں۔ دو مخلص الولا دیکھے۔ ایک مولوی سراج الدین رحمۃ اللہ علیہ۔ دوسرا منشی غلام غوث سلمہ اللہ تعالیٰ۔ لیکن وہ مرحوم حُسن صورت نہیں رکھتا تھا اور خلوص خاص اس کا خاص میرے ساتھ تھا۔ اللہ اللہ دوسرا خیر خواہ خلق حسن و جمال چشم بد دور کمال مہر و وفا صدق و صفا نور علیٰ نور میں آدمی نہیں ہوں آدم شناس ہوں ؎

نگہم نقب ہمیزد بہ نہاں خانۂ دل[3]

مژدہ باد اہل دیا را کہ زمیداں رفتم

گلہ چرخ
اس چرخ کج رفتار کا بُرا ہو ہم نے اس کا کیا بگاڑا تھا۔ ملک و مال

---

[1] اُردوئے معلیٰ صفحہ ۳۰۵۔ [2] دستنبو صفحہ ۴۰۔ [3] اُردوئے معلیٰ صفحہ ۳۳۸۔

و جاہ جلال کچھ نہیں رکھتے تھے۔ ایک گوشہ و توشہ تھا۔ چند مفلس و بینوا ایک جگہ فراہم ہو کر ہنس بول لیتے تھے۔ بیت

سو بھی نہ تو کوئی دم دیکھ سکا اے فلک
اور تو یاں کچھ نہ تھا ایک مگر دیکھنا

یاد رہے یہ شعر خواجہ میر درد کا ہے[1]

فرخ مرزا

پرسوں فرخ مرزا آیا۔ اس کا باپ بھی اس کے ساتھ تھا۔ میں نے اُس سے پوچھا کہ "کیوں صاحب میں تمہارا کون ہوں اور تم میرے کون ہو؟" ہاتھ جوڑ کر کہنے لگا کہ "حضرت آپ میرے دادا ہیں اور میں آپ کا پوتا ہوں"۔ پھر میں نے پوچھا کہ "تمہاری تنخواہ آئی؟" کہا "جناب عالی! اکا جان کی تنخواہ آگئی ہے۔ میری نہیں آئی"۔ میں نے کہا "لوہارو جائے تو تنخواہ پائے"، کہا "حضرت! میں تو اکا جان سے روز کہتا ہوں کہ لوہارو چلو۔ اپنی حکومت چھوڑ کر دلی کی رعیت میں کیوں مل گئے"۔ سبحان اللہ! بالشت بھر کا لڑکا اور یہ فہم درست اور طبع سلیم۔ میں اس کی خوبیٔ خو اور فرخی سیرت پر نظر کرکے اسکو فرخ سیر کہتا ہوں[2]

میر حسن

آج جمعہ کا دن ۲۸ رجادی الثانی اور ۱۱ رجنوری کی صبح کے وقت منھ اندھیرے اُسی وقت آنکھ کھلی تھی۔ لحاف میں لیٹا ہوا پڑا تھا کہ ناگاہ میر نصیر الدین صاحب تشریف لائے اور فرمایا کہ "اب میں جاتا ہوں اور

---

[1] اردوے معلیٰ صفحہ ۱۵۲۔ [2] اردوے معلیٰ صفحہ ۳۱۹۔

...... میر حسن جے پور سے آئے اور خدا جانے کہاں اُترے اور اب کہاں جاتے ہیں۔" ہے ہے مجھے غیر سمجھا کہ میرے ہاں نہ آئے اور مجھ سے نہ ملے۔ اپنی سسرال میں رہے اور میکے کو چھوڑا۔ واللہ میرا جی ان کے دیکھنے کو بہت چاہتا تھا۔ اب اٹھا ہوں۔ سردی رفع ہوئے۔ دھوپ نکل آئے۔ آغا جان کے ہاں آدمی کو بھیجتا ہوں۔ میں کمبخت یہی تو نہیں جانتا کہ آغا جان کہاں رہتے ہیں۔ اب میر احمد علی کی بی بی کے پاس حبش خاں کے پھاٹک آدمی بھیجوں گا جب آغا جان کے گھر کا پتہ معلوم ہو جائے گا اور آدمی دیکھ آئے گا اور یہ بھی معلوم کر آئے گا کہ امیر حسن ہیں تو میں سوار ہو کر جاؤں گا اور اُن سے ملوں گا۔[1]

دوستوں کی فریب دہی

امجد علی شاہ کی سلطنت کے آغاز میں ایک صاحب میرے نیم آشنا خدا جانے کہاں کے رہنے والے کسی زمانے میں وارد اکبر آباد ہوئے تھے۔ کبھی کہیں کے تحصیلدار بھی ہو گئے تھے۔ زبان کے چالاک اکبر آباد میں نوکری کی۔ کہیں کچھ نہ ہوا۔ میرے ہاں دو ایک بار آئے تھے۔ پھر وہ خدا جانے کہاں گئے۔ میں دلی آرہا۔ کم و بیش بیس برس ہوئے ہوں گے۔ امجد علی شاہ کے عہد میں ان کا خط ناگاہ مجھ کو بہ سبیل ڈاک آیا۔ چونکہ اُن دنوں میں دماغ درست اور حافظہ برقرار تھا۔ میں نے جانا کہ یہ وہی بزرگوار ہیں۔ خط میں مجھ کو پہلے یہ مصرع لکھا۔ ؏

از بختِ شکر دارم از روزگار ہم

---

[1] اردوئے معلیٰ صفحہ ۲۵۳

آپ سے جُدا ہو کر بیس برس آوارہ پھرا۔ جے پور میں نوکر ہو گیا۔ وہاں سے دو برس بعد کہاں گیا اور کیا کیا۔ اب لکھنؤ میں آیا ہوں۔ وزیر سے ملا ہوں۔ بہت عنایت کرتے ہیں۔ بادشاہ کی ملازمت انھیں کے ذریعہ سے حاصل ہوئی ہے بادشاہ نے خان اور بہادر کا خطاب دیا ہے۔ مصاحبوں میں نام لکھا ہے مشاہرہ ابھی قرار نہیں پایا۔ وزیر کو میں نے آپ کا بہت مشتاق کیا ہے۔ اگر آپ کوئی قصیدہ حضور کی مدح میں اور عرضی یا خط جو مناسب جانیں وزیر کے نام لکھ کر میرے پاس بھیجد یجیئے گا تو بے شک بادشاہ آپ کو بلائیں گے اور وزیر کا خط فرمان طلب آپ کو پہونچیگا۔

قصیدہ در مدح امجد علی شاہ

میں نے اسی عرصہ میں ایک قصیدہ لکھا جس کی بیت اسم یہ ہے۔ بیت ؎

امجد علی شہ آنکہ بہ ذوقِ دعائے او

صدرہ نماز صبح قضا کرد روزگار

متردد تھا کہ کس کی معرفت بھیجوں۔ توکلت علی اللہ بھیجدیا۔ رسید آگئی صرف۔ پھر دو ہفتے کے بعد ایک خط آیا کہ قصیدہ وزیر تک پہونچا۔ وزیر پڑھکر بہت خوش ہوا۔ بائین شائستہ پیش کرنے کا وعدہ کیا۔ میں متوقع ہوں کہ میاں بدرالدین مہر کن سے میری مہر خطابی کھدوا کر بھیجد یجیئے۔ چاندی کا نگینہ مربع اور قلم جلی۔ فقیر نے سرانجام کر کے بھیجدیا۔ رسید آئی اور قصیدہ کے بادشاہ تک گذرنے کی نوید۔ بس۔ پھر دو مہینے تک اُدھر سے کوئی خط نہ آیا۔ میں نے جو خط بھیجا اُلٹا پھر آیا۔ ڈاک کا یہ توقیع کہ مکتوب الیہ یہاں نہیں ہے۔ ایک مُدّت کے بعد حال معلوم ہوا کہ اس بزرگ کا وزیر تک پہونچنا اور حاضر رہنا سچ۔ بادشاہ کی ملازمت

گیارھواں باب (۱۱)

قولنج کا دورہ ۱۸۵۸ء

بیمار کیا ہوا توقع زیست کی نہ رہی۔ قولنج اور پھر کیسا شدید کہ پانچ پہر مرغ نیم بسمل کی طرح تڑپا کیا۔ آخر عصارۂ ریوند اور ارانڈی کا تیل پیا۔ اس وقت نو بج گیا مگر قصہ تمام نہ ہوا۔...... دس دن میں دو بار آدھی غذا کھائی۔ گویا دس دن میں ایک بار غذا تناول فرمائی گلاب اور املی کا پنا اور آلو بخارے کا افشردہ اس پر مدار رہا۔ کل سے خوفِ مرگ گیا ہے اور صورت زیست کی نظر آئی ہے [۱]

قطعہ وفات ۱۸۵۹ء

بس اس سے زیادہ یاس کیا ہو گی کہ بامید مرگ جیتا ہوں اس راہ سے کچھ مستغنی ہوتا چلا ہوں۔ دو ڈھائی برس کی زندگی اور ہے ہر طرح گذر جائے گی۔ جانتا ہوں کہ تم کو ہنسی آئے گی کہ یہ کیا بکتا ہے۔ مرنے کا زمانہ کون بتا سکتا ہے۔ چاہے الہام سمجھئے چاہے اوہام سمجھئے۔ بیس برس سے یہ قطعہ لکھ رکھا ہے۔ قطعہ

من کہ باشم کہ جاوداں باشم ــــ چو نظیریؔ نماند و طالبؔ مرد
در بگویند در کدامیں سال ــــ مرد غالبؔ بگو کہ غالبؔ مرد

---

[۱] اردوئے معلیٰ صفحہ ۸۱۔ [۲] اردوئے معلیٰ صفحہ ۲۲۸۔

اب بارہ سو چھہتر ہیں اور غالب مرد کے بارہ سو ستر ہیں۔ اس عرصے میں جو کچھ مسرت پہونچنی ہو پہونچ لے ورنہ پھر ہم کہاں[1]۔

نا توانی ۱۸۶۶ء

ناتوانی زور پر ہے۔ بڑھاپے نے نکما کر دیا ہے ضعف، سستی کاہلی، گرانجانی، گرانی، رکاب میں پاؤں ہے۔ باگ پر ہاتھ ہی بڑا سفر دور و دراز درپیش ہے۔ زادِ راہ موجود نہیں۔ خالی ہاتھ جاتا ہوں۔ اگر ناپرسیدہ بخش دیا تو خیر اگر بازپرس ہوئی تو سقر مقر ہے اور ہاویہ زاویہ ہے دوزخ جاوید ہے اور ہم ہیں۔ ہائے کسی کا کیا اچھا شعر ہے[2]؎

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائینگے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائینگے

ایک لطیفہ

رات میں پلنگ پر پڑا ہوا کراہ رہا تھا میر مھدی پاس بیٹھے تھے اٹھکر پاؤں دابنے لگے۔ میں نے کہا "بھئی تو سید زادہ ہے مجھے کیوں گنہگار کرتا ہے"۔ انھوں نے نہ مانا اور کہا کہ "آپ کو ایسا ہی خیال ہے تو پیر دابنے کی اُجرت دیدیجئے گا"۔ میں نے کہا "اس کا مضائقہ نہیں" جب پیر داب چکے تو اُجرت طلب کی۔ میں نے کہا "بھیا! کیسی اُجرت۔ تم نے میرے پاؤں دابے میں نے تمھارے پیسے دابے۔ حساب برابر ہوا[3]"۔

زندگی سے بیزاری

۱۲۷۷ھ میں میرا مرنا صرف میری تکذیب کے واسطے تھا۔ مگر اس تین برس میں ہر روز مرگِ نو کا مزا چکھتا رہا ہوں۔ حیران

---

[1] اُردوئے معلیٰ صفحہ ۲۲۸۔ [2] اردوئے معلیٰ صفحہ ۷۔ [3] نادر خطوط غالب صفحہ ۳۸۔

ہوں کہ کوئی صورت زیست کی نہیں۔ پھر کیوں جیتا ہوں۔ روح میری اب جسم میں اس طرح گھبراتی ہے جس طرح طائر قفس میں۔ کوئی شغل، کوئی اختلاط۔ کوئی جلسہ، کوئی مجمع پسند نہیں آتا۔ کتاب سے نفرت، شعر سے نفرت، جسم سے نفرت روح سے نفرت۔ یہ جو لکھا ہے بے مبالغہ اور بیان واقع[۱] ہے۔ ع

آں روز کزیں منزل ویراں بردم

عوارض فساد خون ۱۸۶۳ء

مہینہ بھر سے زیادہ کا عرصہ ہوا بائیں پاؤں میں ورم کف پا سے، پشت پا کو گھیرتا ہوا پنڈلی تک آ ماس۔ کھڑا ہوتا ہوں تو پنڈلی کی رگیں پھٹنے لگتی ہیں۔ خیر نہ اٹھا۔ روٹی کھانے محلسرا نہ گیا۔ کھانا یہیں منگا لیا اور حوائج کو کیا کروں۔ یہ سب موقع خیال سو بچو لو کہ کیا گذرتی ہو گی۔ ع

پیری و صد عیب چنیں گفتہ اند

اپنا یہ مصرع بار بار چپکے چپکے پڑھتا ہوں۔ ع

اے مرگ ناگہاں تجھے کیا انتظار ہے

مرگ ناگہانی اب کہاں رہی۔ اسباب و آثار سب فراہم ہیں۔ ہائے الٰہی بخش خاں مغفور کا کیا مصرع ہے[۲]۔ ع

آہ جی جاؤں نکل جائے اگر جان کہیں

۱۸۶۳ء

ایک برس سے عوارض فساد خون میں مبتلا ہوں۔ بدن پھوڑوں کی کثرت سے سرو چراغاں ہو گیا۔ طاقت نے جواب دیا۔ دن رات لیٹا رہتا

---

[۱] اردوئے معلیٰ صفحہ ۱۷۰۔ [۲] اردوئے معلیٰ صفحہ ۳۴۵۔

رہتا ہوں۔ کھانا کھاتے وقت پلنگ پر سے اتر لیتا ہوں۔ کھانا کھا کر ہاتھ دھو کر پھر پڑ رہتا ہوں[۱]۔

۱۸۶۵ء

بوڑھا۔ بہرا۔ اپاہج۔ بدحواس ناتوان۔ فلک زدہ آدمی ہوں[۲]۔ تین برس عوارض احتراق خون میں ایسا مبتلا رہا ہوں کہ اپنے جسم و جان کی بھی خبر نہیں رہی[۳]۔

قولنج کا دورہ ۱۸۶۶ء

پاؤں سے اپاہج۔ کانوں سے بہرا۔ ضعفِ بصارت ضعفِ معدہ۔ ان سب ضعفوں پر ضعفِ طالع ...... ایک ہفتہ دو ہفتہ کے بعد ناگاہ قولنج کے دورے کی شدّت ہوتی ہے۔ طاقت جسم میں حالت جان میں نہیں[۴]۔ پیری و صد عیب۔ ساتویں دھاگے کے جھینے گن رہا ہوں۔ قولنج آگے دوری تھا اب دائمی ہو گیا ہے۔ غذا کم ہوتے ہوتے اگر معدوم نہ کہو تو بمنزلہ مفقود کہو۔ پھر گرمی نے مار ڈالا[۵]۔ گرمی میں میرا حال بجنسہ وہ ہوتا ہے جیسا زبان سے پانی پینے والے جانوروں کا۔ خصوصاً اس تموز میں کہ غم و ہم کا ہجوم ہے[۶]۔

آتشِ دوزخ میں یہ گرمی کہاں
سوزِ غمہائے نہانی اور ہے

ایک حرارت غریبہ جگر میں پاتا ہوں مگر صبح سے سوتے وقت تک نہیں جاتا

۱۔ اُردوئے معلیٰ صفحہ ۲۰۔ ۲۔ اُردوئے معلیٰ صفحہ ۱۹۹۔ ۳۔ اُردوئے معلیٰ صفحہ ۱۹۸۔ ۴۔ اُردوئے معلیٰ صفحہ ۴۔ ۵۔ اُردوئے معلیٰ صفحہ ۲۳۰۔ ۶۔ اُردوئے معلیٰ صفحہ ۲۵۷۔

کہ کتنا پانی پی جاتا ہوں[1]۔

اصلاح سے معذوری

ضعف نہایت کو پہونچ گیا۔ رعشہ پیدا ہو گیا۔ بینائی میں بڑا فتور پڑا۔ حواس مختل ہو گئے۔ جہاں تک ہو سکا احباب کی خدمت بجالایا۔ اوراق اشعار لیٹے لیٹے دیکھتا تھا اور اصلاح دیتا تھا۔ اب نہ آنکھ سے اچھی طرح سوجھے نہ ہاتھ سے اچھی طرح لکھا جائے۔ کہتے ہیں کہ شاہ شرف بو علی قلندر کو سبب کبر سن کے خدا نے فرض اور پیمبر نے سنت معاف کر دی تھی متوقع ہوں کہ میرے دوست خدمت اصلاح اشعار مجھ پر معاف کریں[2]۔

غذا

اس مہینے سے یعنی رجب کی آٹھویں سے تہتر واں برس شروع ہوا۔ غذا صبح کو سات بادام کا شیرہ قند کے شربت کے ساتھ۔ دوپہر کو سیر بھر گوشت کا گاڑھا پانی۔ قریب شام کبھی کبھی تین تلے ہوئے کباب۔ چھ گھڑی رات گئے پانچ روپیہ بھر شراب خانہ ساز اور اسی قدر شیرہ۔ اعصاب کے ضعف کا یہ حال کہ اٹھ نہیں سکتا اور اگر دونوں ہاتھ ٹیک کر چارپایہ بن کر اٹھتا ہوں تو پنڈلیاں لرزتی ہیں۔ معہذا دن بھر میں دس بارہ بار اور اسی قدر رات بھر میں پیشاب کی حاجت ہوتی ہے۔ حاجتی پلنگ کے پاس لگی رہتی ہے۔ اٹھا اور پیشاب کیا اور پڑ رہا[3]۔ مشہور ہے یہ بات کہ جو کوئی کسی اپنے عزیز کی فاتحہ دلاتا ہے موتے کی روح کو اس کی بو پہونچتی ہے۔ ایسے ہی میں سونگھ لیتا ہوں غذا کو۔ پہلے مقدار غذا کی تولوں پہ منحصر تھی اب ماشوں پہ ہے۔ زندگی کی توقع آگے مہینوں پہ تھی اب دنوں پہ ہے[4]۔

---

[1] اردوئے معلیٰ صفحہ ۲۳۰۔ [2] اردوئے معلیٰ صفحہ ۲۰۰۔ [3] اردوئے معلیٰ صفحہ ۳۰۔ [4] اردوئے معلیٰ صفحہ ۲۸

زندگی سے مایوسی ۱۸۶۷ء

آگے ناتواں تھا اب نیمجاں ہوں۔ آگے بہرا تھا اب اندھا ہوا چاہتا ہوں۔ رعشہ و ضعفِ بصر۔ جہاں چار سطریں لکھیں اُنگلیاں ٹیڑھی ہوگئیں۔ اکہتّر برس جیا بہت جیا۔ اب زندگی برسوں کی نہیں۔ مہینوں کی نہیں۔ دنوں کی ہے۔[1] میں اب چراغِ سحری ہوں۔ رجب ۱۲۸۴ھ حال کی آٹھویں تاریخ سے اکہتّرواں سال شروع ہوگیا۔ طاقت سلب۔ حواس مفقود۔ امراض مستولی۔[2] میں ایک قالب بے روح ہوں۔ بقول نظامی ع

یکے مردہ شخصم بمردی رواں

دھوپ کے دیکھنے کی تاب نہیں۔ رات کو صحن میں سوتا ہوں۔ مجھ کو دو آدمی ہاتھوں پر لیکر دالان میں لے آتے ہیں۔ ایک کوٹھری ہے اندھیری اُس میں ڈال دیتے ہیں۔ تمام دن اس گوشۂ تاریک میں پڑا رہتا ہوں۔ شام کو پھر بدستور دو آدمی لیجا کر پلنگ پر صحن میں ڈال دیتے ہیں۔[3]

دہلی کے اخبار

ہاتھ میں رعشہ آنکھوں میں ضعف بصر۔ کوئی متصدی میرا نوکر نہیں دوست آشنا کوئی آجاتا ہے تو اس سے جواب لکھوا دیتا ہوں بھائی میں تو اب کوئی دن کا مہمان ہوں اور اخبار والے میرا حال کیا جانیں۔ ہاں اکمل الاخبار اور اشرف الاخبار والے کہ یہاں کے رہنے والے ہیں اور مجھ سے ملتے رہتے ہیں سوان کے اخبار میں میں نے اپنا حال مفصل چھپوا دیا ہے اور اس میں میں نے عذر چاہا خطوں کے جواب سے اور اشعار کی اصلاح سے۔

---

[1] اردوئے معلیٰ صفحہ ۲۶۔ [2] اردوئے معلیٰ صفحہ ۳۱۵۔ [3] اُردوئے معلیٰ صفحہ ۲۳۰۔

اس پر کسی نے عمل نہ کیا۔ اب تو ہر طرف سے خطوں کے جواب کا تقاضا اور اشعار واسطے اصلاح کے چلے آتے ہیں اور میں شرمندہ ہوتا ہوں۔ بوڑھا، اپاہج، بہرا آدھا اندھا۔ دن رات پڑا رہتا ہوں[1]۔ ستر ابہترا بوڑھا اپاہج آدمی ہوں۔ اب نجات چاہتا ہوں۔ بہت جیا کہاں تک جیوں گا[2]۔

ضعف ۱۸۶۸ء

ہجوم غمہائے نہانی کا ذکر کیا کروں جیسا کہ ابر سیاہ چھا جاتا ہے یا ٹڈی دل آتا ہے[3]۔ آگے اتنی طاقت تھی کہ لیٹے لیٹے کچھ لکھتا تھا اب وہ طاقت بھی زائل ہوگئی۔ ہاتھ میں رعشہ پیدا ہوگیا۔ بینائی ضعیف ہوگئی متصدی کو رکھنے کا مقدور نہیں۔ عزیزوں دوستوں میں سے کوئی صاحب وقت پر آگئے تو مطلب کہتا گیا اور وہ لکھتے گئے[4]۔

تہترواں سال

میری تہتر برس کی عمر ہے۔ بس میں احزاف ہوا۔ حافظہ گویا کبھی تھا ہی نہیں۔ سامعہ باطل بہت دن سے تھا۔ رفتہ رفتہ وہ بھی حافظہ کی مانند معدوم ہوگیا۔ اب مہینہ بھر سے یہ حال ہے کہ جو دوست آتے ہیں رسمی پرسش مزاج سے بڑھکر جو بات ہوتی ہے وہ کاغذ پر لکھ دیتے ہیں۔ غذا مفقود ہے۔ صبح کو قند اور شیرہ بادام مقشر۔ دوپہر گوشت کا پانی۔ سر شام تلے ہوئے چار کباب سوتے وقت پانچ روپے بھر شراب اور اسی قدر گلاب حزف ہو۔ پوچ ہوں عاصی ہوں۔ فاسق ہوں، روسیاہ ہوں۔ یہ شعر میر تقی میر کا میرے حسب حال ہے ؎

---

[1] اردوئے معلیٰ صفحہ ۱۲۔ [2] اردوئے معلیٰ صفحہ ۵۔ [3] اردوئے معلیٰ صفحہ ۳۔ [4] اردوئے معلیٰ صفحہ ۱۲۳

مشہور ہیں عالم میں مگر ہوں بھی کہیں ہم
القصّہ نہ در پے ہو ہمارے کہ نہیں ہم [۱]

تصویر کھنچوانے سے انکار

صاحب اس بڑھاپے میں تصویر کے پردے میں کھچا کھچا پھروں۔ گوشہ نشین آدمی عکس کی تصویر اُتارنے والے کو کہاں ڈھونڈھوں [۲]

مصوّروں کی شکایت

تصویر کا حال یہ ہے کہ ایک مصوّر صاحب میرے دوست میرے چہرے کی تصویر اُتار کر لے گئے۔ اس کو تین مہینے ہوئے آج تک بدن کا نقشہ اُتروانے نہیں آئے۔ میں نے گوارا کیا آئینہ پر نقشہ اُتروانا بھی۔ ایک دوست اس کام کو کرتے ہیں۔ عید کے دن وہ آئے تھے۔ میں نے اُن سے کہا کہ "بھائی میری شبیہ کھینچ دو" وعدہ کیا تھا کہ کل تو نہیں پرسوں اسباب کھینچنے کا لے کر آؤں گا۔ شوال، ذیقعدہ، ذی الحجہ، محرم یہ پانچواں مہینہ ہے۔ آج تک نہیں آئے [۳]

تصویر کا گم ہونا

آج منگل ۱۹ر جون ۱۸۶۷ء ۱۲ بجے عنایت نامہ (از شاہزادہ بشیر الدین صاحب) آیا۔ سرنامہ دیکھ کر سفیدہ صبح مراد سمجھا۔ تنگا ایک چھوٹی سی خس کی ٹٹی کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ خط پڑھ کر وہ حال طاری ہوا کہ تنگا نہ ہوتا تو گریبان پھاڑ ڈالتا۔ اگر جان عزیز نہ ہوتی تو سر پھوڑتا اور کیونکر اس غم کی تاب لاتا کہ میں نے اپنے کو کھنچوا کر بصورت تصویر آپکی خدمت میں بھیجا .... اس فرمان میں اس لفافہ کی رسید نہ پائی۔ ظاہر اڈاک پر ڈاکو گرے اور میرے پیکر بے روح کے ٹکڑے اڑا دیئے۔ [۴]

---

[۱] اُردوئے معلیٰ صفحہ ۲۴ - [۲] اُردوئے معلیٰ صفحہ ۱۵ - [۳] اُردوئے معلیٰ صفحہ ۲۳ [۴] اُردوئے معلیٰ صفحہ ۹۰

بارھواں باب (۱۲)

تعلیم

میں نے ایام دبستاں نشینی میں "شرح مائۃ عامل" تک پڑھا۔ بعد اسکے لہو و لعب اور آگے بڑھکر فسق و فجور و عیش و عشرت میں منہمک ہو گیا[۱]

اُردو میں شاعری کی ابتدا

خاکسار نے ابتدائے سن تمیز میں اُردو زبان میں سخن سرائی کی ہے۔ پھر اوسط عمر میں بادشاہ دہلی کا نوکر ہو کر چند روز اسی روش پر خامہ فرسائی کی ہے[۲]

شاعری

بچپن میں جب میں ریختہ لکھنے لگا ہوں لعنت ہے مجھ پر اگر میں نے کوئی ریختہ یا اس کے قوافی پیش نظر رکھ لئے ہوں صرف بحر و ردیف و قافیہ تو دیکھ لیا اور اس زمین میں غزل اور قصیدہ لکھنے لگا......... بھائی شاعری معنی آفرینی ہے قافیہ پیمائی نہیں۔

بیدل کی تقلید

ابتدائے فکر سخن میں بیدل و اسیر و شوکت کے طرز پر ریختہ لکھتا تھا۔ چنانچہ ایک غزل کا مقطع تھا ؎

طرزِ بیدل میں ریختہ کہنا
اسد اللہ خاں قیامت ہے

---

[۱] رسالہ ہندوستانی بابۃ جنوری ۱۹۳۲ء ص ۵۲۔ [۲] اُردوئے معلی صفحہ ۱۶۴۔

۱۵ برس کی عمر سے ۲۵ برس کی عمر تک مضامین لکھا کیا۔ دس برس میں بڑا دیوان جمع ہوگیا۔ آخر جب تمیز آئی تو اس دیوان کو دور کیا۔ اوراق یک قلم چاک کئے۔ دس پندرہ شعر واسطے نمونہ کے دیوانِ حال میں رہنے دیئے۔[۱]

دیوان کا چاک کرنا

میری شاعری ملکۂ فطری ہے۔ میں نے شاعری خود نہیں اختیار کی بلکہ ملکۂ شاعری نے خود مجھے مجبور کیا کہ میں اس کو اپنا فن قرار دوں۔

ملکۂ فطری

ما نبودیم بدیں مرتبہ راضی غالب
شعر خود خواہشِ آں کرد کہ گردد فنِ ما[۲]

میرا کلام میرے پاس کبھی کچھ نہیں رہا۔ نواب ضیاءالدین خاں اور نواب حسین مرزا جمع کر لیتے تھے۔ جو میں نے کہا انھوں نے لکھ لیا۔ ان دونوں کے گھر لٹ گئے۔ ہزاروں روپے کے کتب خانے برباد ہو گئے۔ اب میں اپنے کلام کے دیکھنے کو ترستا ہوں۔ کئی دن ہوئے کہ ایک فقیر کہ وہ خوش آواز بھی ہے اور زمزمہ پرداز بھی ہے۔ ایک غزل میری کہیں سے لکھوا لایا۔ اس نے وہ کاغذ جو مجھ کو دکھایا یقین سمجھنا کہ مجھکو رونا آیا۔[۳] غزل

کلام کا ضائع ہونا

ایک غزل

درد منت کشِ دوا نہ ہوا — میں نہ اچھا ہوا برا نہ ہوا
جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو — اک تماشہ ہوا گلہ نہ ہوا

---

[۱] عودِ ہندی صفحہ ۲۶۰۔ [۲] نادر خطوط غالب صفحہ ۳۸۔ [۳] اردوئے معلیٰ صفحہ ۲۱۳۔

رہزنی ہے کہ دلستانی ہے — لیکے دل دلستاں روانہ ہوا

زخم گر دب گیا لہو نہ تھما — کام گر رک گیا روانہ ہوا

کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب — گالیاں کھا کے بدمزہ نہ ہوا

کیا وہ نمرود کی خدائی تھی — بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا

جان دی دی ہوئی اسی کی تھی — حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

کچھ تو پڑھئے کہ لوگ کہتے ہیں
آج غالبؔ غزل سرا نہ ہوا

نئی زمین

بس پچاس برس کی بات ہے کہ الٰہی بخش خاں مرحوم نے ایک زمین نکالی۔ میں نے حسب الحکم غزل لکھی۔ بیت الغزل یہ ہے ؎

پلا دے اوک سے ساقی جو ہم سے نفرت ہے
پیالہ گر نہیں دیتا نہ دے شراب تو دے

اُردو دیوان اور غزلیں

اُردو کے دیوان چھاپے کے ناقص ہیں۔ بہت غزلیں اُن میں نہیں ہیں۔ قلمی دیوان جو اتم و اکمل تھے وہ لٹ گئے۔ یہاں سب کو کہہ رکھا ہے کہ جہاں بکتا ہوا نظر آ جائے لے لو۔ ایک بات اور...... خیال میں رہے کہ میری غزل پندرہ سولہ بیت کی بہت شاذ و نادر ہے۔ بارہ بیت سے اور نو شعر سے کم نہیں ہوتی[1]۔ ایک دوست کے پاس اُردو کا دیوان چھاپے سے کچھ زیادہ ہے۔ اُس نے کہیں کہیں سے مسوّدات متفرق بہم پہنچائے ہیں۔ چنانچہ "پنہاں ہو گئیں" "ویراں ہو گئیں"، یہ غزل مجھکو

---

[1] اُردوئے معلےٰ صفحہ ۳۰۱۔

اُس سے ہاتھ آگئی ہے[1]

منشی ممتاز علی

جب میں رامپور سے میرٹھ آیا بھائی ضیاء الدین خاں صاحب کے مکان پر اُترا۔ وہاں منشی ممتاز علی صاحب میرے دوست قدیم مجھ کو ملے انھوں نے کہا کہ اپنا اُردو کا دیوان مجھ کو بھیج دیجیے گا۔ عظیم الدین کتب فروش اس کو چھاپا چاہتا ہے ...... دیوان ریختہ اتم و اکمل کہاں تھا مگر ہاں میں نے غدر سے پہلے لکھوا کر نواب یوسف علی خاں بہادر کو رامپور بھیجدیا تھا اب جو میں دلی سے رامپور جانے لگا تو بھائی ضیاء الدین خاں صاحب نے مجھے تاکید کر دی تھی کہ تم نواب صاحب کی سرکار سے دیوان اُردو لے کر اُس کو کسی کاتب سے لکھوا کر بسبیل ڈاک ضیاء الدین خاں کو دلی بھیجدینا۔ آمدم برسر مطلب سابق۔ اب جو منشی ممتاز علی صاحب نے مجھ سے کہا تو مجھے یہی کہتے بن آئی کہ "اچھا دیوان تو میں ضیاء الدین خاں سے لے کر بھیجدوں گا مگر کاپی کی صحت کا ذمّہ کون کرتا ہے"۔ نواب مصطفیٰ خاں نے کہا کہ "میں"...... دلی آکر ضیاء الدین خاں سے دیوان لے کر ایک آدمی کے ہاتھ نواب مصطفیٰ خاں کے پاس بھیجدیا[2]

لکھنؤ کے چھاپے کی تعریف

دیوان اُردو چھپ چکا ہے۔ لکھنؤ کے چھاپے خانے نے جس کا دیوان چھاپا اس کو آسمان پر چڑھا دیا۔ حسنِ خط سے الفاظ کو چمکا دیا۔ دلی پر اور اس کے بانی پر اور چھاپے پر لعنت ہے

---

[1] اُردوئے معلیٰ صفحہ ۳۰۱ - [2] اردوئے معلیٰ صفحہ ۳۱۱-

صاحب دیوان کو اس طرح یاد کرتے ہیں جیسے کوئی کتّے کو آواز دے۔ ہر کاپی کو دیکھتا رہا ہوں۔ کاپی نگار اور تھا، متوسط جو کاپی میرے پاس لایا کرتا تھا وہ اور تھا۔ اب جو دیوان چھپ چکا۔ حق التصنیف ایک مجھ کو ملا۔ غور کرتا ہوں تو وہ

کاتبوں کی شکایت

الفاظ جوں کے توں یعنی کاپی نگار نے نہ بنائے۔ ناچار غلط نامہ لکھا وہ چھپا۔ ہائے خدا کی مار کاتبان ناہنجار پہ۔ میرا دیوان اور پنج آہنگ اور مہر نیم روز ستیاناس کر کے چھوڑ دیا۔[۱]

اُردو نثر لکھنے میں عار

جناب ہنری اسٹورٹ ریڈ صاحب ...... ان کی فرمائش ہے اُردو نثر کی وہ انجام پائے تو اس کے ساتھ ان کو لکھوں مگر بھائی تم غور کرو اُردو میں میں اپنے قلم کا زور کیا صرف کروں گا اور اس عبارت میں معنیٰ نازک کیونکر بھروں گا۔ ابھی تو یہی سوچ رہا ہوں کہ کیا لکھوں۔ کون سی بات، کون سی کہانی، کون سا مضمون تحریر اور کیا تدبیر کروں۔[۲] ریڈ صاحب صاحبی کرتے ہیں۔ میں اُردو میں اپنا کمال کیا ظاہر کر سکتا ہوں۔ اس میں گنجائش عبارت آرائی کی کہاں ہے۔ بہت ہوگا تو یہ ہوگا کہ میری اُردو بہ نسبت اوروں کی اُردو کے فصیح ہوگی۔ میرا یہ منصب ہے کہ مجھ پر اُردو کی فرمائش ہو۔ خیر ہوئی۔ اب میں کہانیاں، قصّے کہاں ڈھونڈتا پھروں۔ کتاب نام کو میرے پاس نہیں ہے۔[۳]

خطوط سے شوق

میں اس تنہائی میں صرف خطوں کے بھروسے جیتا ہوں یعنی

---

۱ اُردوئے معلی صفحہ ۱۲۰۔ ۲ نادر خطوط غالب صفحہ ۵۷۔ ۳ نادر خطوط غالب صفحہ ۲۹۷۔ ۴ نادر خطوط غالب صفحہ ۳۰۰

جس کا خط آیا میں نے جانا کہ وہ شخص تشریف لایا۔ خدا کا احسان ہے کہ کوئی دن ایسا نہیں ہوتا کہ جو اطراف و جوانب سے دو چار خط نہیں آرہتے ہوں بلکہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ دو بار ڈاک کا ہرکارہ خط لاتا ہے .... مجھ کو جو دوست خط بھیجتا ہے وہ صرف شہر کا نام اور میرا نام لکھتا ہے۔ محلہ کی ضرورت نہیں[1]

فارسی میں خطوط لکھنا موقوف

زبان فارسی میں خطوں کا لکھنا پہلے سے متروک ہے پیرانہ سالی وضعف کے صدموں سے محنت پژوہی و جگرکاوی کی قوت مجھ میں نہیں رہی۔ حرارت غریزی کو زوال ہے اور یہ حال ہے۔ شعر

مضمحل ہوگئے قوی غالب وہ عناصر میں اعتدال کہاں

اُردو میں خطوط

سب دوستوں کو جن سے کتابت رہتی ہے اُردو ہی میں نیاز نامے لکھا کرتا ہوں۔ جن جن صاحبوں کی خدمت میں آگے آگے میں نے فارسی زبان میں خطوط لکھے اور بھیجے تھے ان میں سے جو صاحب الی الآن موجود ہیں ان سے بھی عندالضرورت اسی زبان مروّج میں مکاتبت و مراسلت کا اتفاق ہوا کرتا ہے[2]

القاب وآداب

خط میں بڑے بڑے القاب وآداب سے میں خوش نہیں ہوتا۔ جب تعلق اور نسبت قوی ہو جاتی ہے تو پھر آداب کی ضرورت نہیں رہتی ہے[3]

---

[1] اُردوئے معلیٰ صفحہ ۱۶۱۔ [2] اُردوئے معلیٰ صفحہ ۱۷۴۔ [3] نادر خطوط غالب صفحہ ۴۸۔

طرز تحریر

میں نے آئین نامہ نگاری چھوڑ کر مطالب نویسی پہ مدار رکھا ہے[1]۔ میں نے وہ انداز تحریر ایجاد کیا ہے کہ مراسلہ کو مکالمہ بنا دیا ہے۔ ہزار کوس سے بزبان قلم باتیں کیا کرو۔ ہجر میں وصال کے مزے لیا کرو[2]۔ کیوں سچ کہیو! اگلوں کے خطوط کی یہی طرز تھی۔ ہائے کیا اچھا شیوہ ہے۔ جب یوں نہ لکھو وہ خط ہی نہیں ہے۔ چاہ بے آب ہے۔ ابر بے باراں ہے۔ نخل بے ثمر ہے۔ خانہ بے چراغ ہے۔ چراغ بے نور ہے۔ ہم جانتے ہیں تم زندہ ہو تم جانتے ہو ہم زندہ ہیں[3]۔

رقعات کے چھاپے جانے سے انکار (۱۸۵۸ء)

رقعات کے چھاپے جانے میں ہماری خوشی نہیں ہے .... یہ امر میرے خلاف رائے ہے[4]۔

تذکرۂ شعرائے ہند

رنگین صاحب ...... تذکرہ شعرائے ہند کا انگریزی میں لکھتے ہیں۔ مجھ سے انھوں نے مدد چاہی۔ میں نے سات کتابیں بھائی ضیاء الدین صاحب سے مستعار لے کر ان کے پاس بھیج دیں۔ پھر انھوں نے مجھ سے کہا کہ جن شعرا کو تو اچھی طرح جانتا ہے ان کا حال لکھ بھیج۔ میں نے ۱۶ آدمی لکھ بھیجے بقید حیات اس کے کہ اب زندہ موجود ہیں اور اس سواد کی صورت یہ ہے نواب ضیاء الدین احمد خاں بہادر رئیس لوہارو فارسی و اردو دونوں میں شعر کہتے ہیں۔ فارسی میں نیر اور اردو میں رخشاں تخلص

---

[1] اردوئے معلیٰ صفحہ ۱۶۷۔ [2] اردوئے معلیٰ صفحہ ۲۱۲۔ [3] اردوئے معلیٰ صفحہ ۱۴۹۔ [4] اردوئے معلیٰ صفحہ ۱۸

کرتے ہیں۔ اسد اللہ خاں غالب کے شاگرد۔ نواب مصطفےٰ خاں بہادر علاقہ دار جہانگیر آباد اُردو میں شیفتہ اور فارسی میں حسرتی تخلص کرتے ہیں اور اُردو میں مومن خاں کو اپنا کلام دکھاتے تھے۔ منشی ہرگوپال معز زقانون گو سکندر آباد فارسی شعر کہتے ہیں۔ تفتہ تخلص کرتے ہیں۔ اسد اللہ خاں غالب کے شاگرد......

اصل یہ ہے کہ تذکرہ انگریزی زبان میں لکھا جاتا ہے۔ اشعار ہندی اور فارسی کا ترجمہ شامل نہ کیا جائے گا۔ صرف شاعر کا نام اور اس کے اُستاد کا نام اور شاعر کے مسکن و موطن کا نام مع تخلص درج ہوگا[1]

[1] اردوئے معلیٰ صفحہ ۷۷۔

تیرھواں باب (۱۳)

فارسی سے عشق

نظم و نثر فارسی کا عاشق و مائل ہوں۔ ہندوستان میں رہتا ہوں مگر تیغ اصفہانی کا گھائل ہوں۔ جہاں تک زور چل سکا فارسی میں بہت کچھ لکھا[1]

مشق سخن

علم و ہنر سے عاری ہوں لیکن پچپن برس سے محو سخن گذاری ہوں مبدأ فیاض کا مجھ پر احسان عظیم۔ ماخذ میرا صحیح اور طبع میری سلیم ہے

فارسی سے مناسبت

فارسی کے ساتھ ایک مناسبت ازلی و سرمدی لایا ہوں۔ مطابق اہل پارس کے منطق کا بھی مزہ ابدی لایا ہوں مناسبتِ خداداد تربیتِ اُستاد، حُسن و قبح ترکیب پہچاننے فارسی کے غوامض جاننے لگا۔[2] بدو فطرت سے میری طبیعت کو زبان فارسی سے لگاؤ تھا۔ چاہتا تھا فرہنگوں سے بڑھ کر کوئی ماخذ مجھ کو ملے۔ بارے مراد بر آئی۔[3] ناگاہ ایک شخص کہ ساسان پنجم کی نسل میں سے معہذا منطق و فلسفہ میں مولوی فضل حق مرحوم کا نظیر اور مومن و موحد و صوفی صافی تھا۔ میرے شہر (آگرہ) میں وارد ہوا[4] فقیر کے مکان پر دو برس رہا۔ لطائف فارسی بحت اور غوامض فارسی آمیختہ

---

[1] اردوئے معلیٰ صفحہ ۱۶۴۔ [2] اُردوئے معلیٰ صفحہ ۱۷۷۔ [3] مکاتیب غالب صفحہ ۸۲۔ [4] رسالہ "ہندوستانی" جنوری ۱۹۳۴ء۔ [5] مکاتیب غالب صفحہ ۸۲۔

بہ عربی اُس سے میرے حالی ہوئے۔ سونا کسوٹی پر چڑھ گیا۔ ذہن معوج نہ تھا زبان دری سے پیوند ازلی اور استاد بے مبالغہ جاماسپ عہد و بزرجمہر عصر تھا حقیقت اس زبان کی دلنشین و خاطر نشان ہو گئی[1]۔

اہل زبان کی تقلید

میں اہل زبان کا پیرو اور ہندیوں میں سوائے امیر خسرو دہلوی کے سب کا منکر ہوں۔ جب تک قدما یا متاخرین میں مثل صائب و کلیم و اسیر و حزیں کے کلام میں کوئی لفظ یا ترکیب نہیں دیکھ لیتا اس کو نظم اور نثر میں نہیں لکھتا[2]۔ فارسی کی تکمیل کے واسطے اصل الاصول

اصولِ تکمیل فارسی

مناسبت طبیعت کی ہے۔ پھر تتبع کلام اہل زبان لیکن نہ اشعار قتیل و واقف و شعرائے ہندوستان کہ یہ اشعار سوائے اس کے کہ اُن کو موزونی طبع کا نتیجہ کہئے اور کسی تعریف کے شایاں نہیں ہیں۔ نہ ترکیب فارسی نہ معنی نازک ہاں الفاظ فرسودہ عامیانہ جو اطفال دبستان جانتے ہیں اور جو متصدی نثر میں درج کرتے ہیں وہ الفاظ فارسی یہ لوگ نظم میں خرچ کرتے ہیں۔ جب رودکی و عنصری و خاقانی و رشید وطواط اور ان کے امثال و نظائر کا کلام بالاستیعاب دیکھا جائے اور انکی ترکیبوں سے آشنائی بہم پہونچے اور ذہن اعوجاج کی طرف نہ لے جائے تب آدمی جانتا ہے کہ ہاں فارسی یہ ہے[3]۔

فارسی نظم و نثر

ضیاء الدین خاں جاگیردار لوہارو میرے سبقی بھائی اور میرے

---

[1] رسالہ "ہندوستانی" جنوری ۱۹۳۲ء۔ [2] عود ہندی صفحہ ۲۵۔ [3] عود ہندی صفحہ ۱۱۔

شاگردِ رشید بھی ہیں۔ جو نظم و نثر میں نے کچھ لکھا وہ انھوں نے لیا اور جمع کیا چنانچہ کلیاتِ نظمِ فارسی جو چوّن بچپن جزو اور پنج آہنگ اور مہر نیمروز اور اردو دیوان ریختہ سب مل کر سو سوا سو جزو مطلّی اور مذہّب اور انگریزی ابرے کی جلدیں الگ الگ کوئی ڈیڑھ سو دو سو روپیہ کے صرف میں بنوائی۔ میری خاطر جمع کہ کلام میرا سب یکجا فراہم ہے پھر ایک شاہزادے نے اس مجموع نظم و نثر کی نقل کی۔ اب دو جگہ میرا کلام اکٹھا ہوا۔ کہاں سے یہ فتنہ برپا ہوا اور شہر لٹے

کتب خانوں کی بربادی

اور دونوں جگہ کا کتابخانہ خوانِ یغما ہو گیا۔ ہر چند میں نے آدمی دوڑائے کہیں سے ان میں سے کوئی کتاب ہاتھ نہ آئی۔ وہ سب قلمی ہیں[1]

پنج آہنگ

چھاپے کی پنج آہنگیں اب بھی بکتی ہیں اور معیوب بدو عیب ہیں۔ ایک تو یہ کہ جو بعد انطباع از قسمِ نثر تحریر ہوا ہے وہ اس میں نہیں۔ دوسرے یہ کہ کاپی نویس نے وہ اصلاح میری نثر کو دی ہے کہ میرا جی جانتا ہے۔ اگر کہوں کوئی سطر غلطی سے خالی نہیں تو اغراق ہے۔ بے مبالغہ یہ ہے کہ کوئی صفحہ اغلاط سے خالی نہیں[2]

ماہِ نیم ماہ و مہرِ نیمروز

اکثر صاحب اطراف و جوانب سے ماہ نیم ماہ بھیجنے کا حکم بھیجتے ہیں۔ اور میں جی میں کہتا ہوں کہ جب مہرِ نیمروز کی عبارت کو نہیں سمجھتے تو ماہ نیم ماہ کو لے کر کیا کریں گے۔ صاحب! نیمروز

---

[1] اُردوئے معلیٰ صفحہ ۲۹۷۔ [2] اردوئے معلیٰ صفحہ ۱۶۳۔

کے دیباچہ میں میں نے لکھ دیا ہے کہ اس کتاب کا نام "پرتوستان" ہے اور اس کے
دو مجلد ہیں۔ پہلی جلد میں ابتدائے خلقتِ عالم سے ہمایوں کی سلطنت کا ذکر
دوسرے حصے میں اکبر سے بہادر شاہ تک کی سلطنت کا بیان پہلے حصّہ کا نام
"مہر نیم روز" دوسرے حصّہ کا نام "ماہ نیم ماہ" ہے۔ بارے پہلا حصّہ تمام ہوا۔ چھاپا گیا
جابجا بھیجا گیا۔ قصد تھا جلال الدین اکبر کے حالات لکھنے کا کہ امیر تمر تک نام
ونشان مٹ گیا۔ آں دفتر را گاؤ خورد و گاؤ را قصاب بُرد و قصاب در راہ مُرد[1]

قاطع بُرہان

۱۸۶۱ء یعنی سال گذشتہ میں "قاطع بُرہان" چھپی۔ پچاس جلدیں میں
نے مول لیں[2]۔ اس درماندگی کے دنوں میں چھاپے کی "بُرہان قاطع"
میرے پاس تھی اس کو میں دیکھا کرتا تھا۔ ہزارہا لغت غلط، ہزارہا بیان لغو،
عبارت پوچ، اشارت پادر ہوا۔ میں نے سو دو سو لغت کے اغلاط لکھ کر ایک
مجموعہ بنایا اور "قاطع برہان" اس کا نام رکھا ہے[3]

کلیات فارسی

فارسی کا دیوان بیس پچیس برس کا عرصہ ہوا جب چھپا تھا۔ پھر نہیں چھپا
مگر ہاں سال گذشتہ میں منشی نولکشور نے شہاب الدین خاں کو لکھکر
کلیات فارسی جو ضیاء الدین خاں نے غدر کے بعد بڑی محنت سے جمع کیا تھا وہ
منگا لیا اور چھاپنا شروع کیا۔ وہ پچاس جزو میں یعنی کوئی مصرع میرا اُس سے
خارج نہیں۔ اب سُنا ہے کہ وہ چھپ کر تمام ہو گیا[4]

دستنبو

میں نے ۱۱ر مئی ۱۸۵۷ء سے ۳۱ر جولائی ۱۸۵۸ء تک روداد نثر میں

۱؎ اردوئے معلیٰ صفحہ ۱۱۲۔ ۲؎ اُردوئے معلیٰ صفحہ ۱۰۰۔ ۳؎ اُردو معلیٰ۔ ۴؎ اُردوئے معلیٰ صفحہ ۱۰۰۔

بعبارت فارسی نا آمیختہ بعربی لکھی ہے اور وہ پندرہ سطر کے مسطر سے چار جزو کی کتاب آگرہ کو مطبع مفید الخلایق میں اپنی سرگزشت اور اپنے مشاہدہ کے بیان سے کام رکھا ہے[۱] اور ایک قصیدہ متعارف عربی و فارسی ملی ہوئی زبان میں حضرت فلک رفعت جناب ملکہ معظمہ انگلستان کی ستائش میں اس نثر کے ساتھ شامل ہے[۲]۔ کتب دستنبو کے بک جانے سے میں خوش ہوا......

قصیدہ ملکۂ انگلستان

آخر یہ جنس پڑی نہ رہی بک گئی۔ بھائی ہندوستان کا قلمرو بے چراغ ہو گیا۔ لاکھوں مر گئے۔ جو زندہ ہیں ان میں سیکڑوں گرفتار بند بلا ہیں۔ جو زندہ ہے اُس میں مقدور نہیں۔ میں ایسا جانتا ہوں کہ یا تو صاحبانِ انگریز کی خریداری آئی ہوگی یا پنجاب کے ملک کو یہ کتابیں گئی ہونگی۔ پورب میں کم بکی ہوں گی[۳]

دستنبو کی خریداری

کیا کروں اپنا شیوہ ترک نہیں کیا جاتا۔ وہ روش ہندوستانی فارسی لکھنے والوں کی مجھ کو نہیں آتی کہ بالکل بھاٹوں کی طرح بکنا شروع کر دیا۔ میرے قصیدے دیکھو تشبیب کے شعر بہت کم پاؤگے اور مدح کے شعر کمتر۔ نثر میں بھی یہی حال ہے۔ نواب مصطفےٰ خاں کے تذکرے کی تقریظ کو ملاحظہ کرو کہ ان کی مدح کتنی ہے۔ مرزا رحیم الدین بہادر حیاؔ تخلص کے دیوان کے دیباچہ کو دیکھو۔ وہ جو تقریظ دیوان حافظؔ کے بموجب جان جاکوب بہادر کے لکھی

فارسی کا طرز تحریر

---

[۱] اردوئے معلیٰ صفحہ ۲۵۷۔ [۲] اردوئے معلیٰ صفحہ ۱۶۶۔ [۳] اردوئے معلیٰ صفحہ ۳۰۲۔

ہے۔ اس کو دیکھو کہ فقط ایک بیت۔ ان کا نام اور ان کی مدح آئی ہے اور باقی ساری نثر میں کچھ اور ہی مطالب ہیں۔ واللہ باللہ[۱]

فارسی نثروں کی اشاعت

فارسی مکتوبوں اور رسالوں اور نسخوں اور کتابوں کے مجموع اجزا چھاپا ہو کر اطراف و اقصائے عجم میں پھیل گئے۔ حال کی نثروں کو کون فراہم کرے۔ جو نثریں کہ مجموع و یکجا ہو کر جہاں جہاں منتشر ہو گئی ہیں اور آئندہ ہوں اُنھیں کو جناب احدیت جلت عظمتہٗ مقبول قلوبِ اہلِ سخن و مطبوع طبائع اربابِ فن فرمائے۔[۲]

---

۱ اردوئے معلی صفحہ ۶۲ ۔ ۲ اردوئے معلی صفحہ ۱۲۷

چودھواں باب[۱۴]

ایک میزان

میں فارسی کا محقق ہوں۔ ایک میزان عرض کرتا ہوں۔ ان صاحبوں کے کلام کو یعنی ہندیوں کے اشعار کو قتیل اور واقف سے لیکر بیدل اور ناصر علی تک اس میزان میں تولیں۔ رودکی و فردوسی سے لیکر خاقانی و ثنائی و انوری وغیرہم تک ایک گروہ۔ ان حضرات کا کلام تھوڑی تفاوت سے ایک وضع پر ہے۔ پھر حضرت سعدی طرز خاص کے موجد ہوئے۔ فغانی ایک اور شیوۂ خاص کا مبدع ہوا۔ خیالہائے نازک و معانی بلند لایا۔ اس شیوہ کی تکمیل کی ظہوری و نظیری و عرفی و نوعی نے سبحان اللہ! قلب سخن میں جان پڑ گئی۔ اس روش کو صاحبانِ طبع نے سلاست کا چربہ دیا۔ صایب و کلیم و سلیم و قدسی و حکیم شفائی اسی زمرہ میں ہیں اور رودکی و اسدی و فردوسی یہ شیوہ سعدی کے وقت میں ترک ہوا اور سعدی کے طرز نے بسبب سہل ممتنع ہونے کے رواج نہ پایا فغانی کا انداز پھیلا اور اُس میں نئے نئے ڈھنگ پیدا ہونے لگے۔ تو اب طرزیں تین ٹھہریں۔ خاقانی اس کے اقران ظہوری اس کے امثال صایب اسکے

---

[۱] اُردوئے معلیٰ صفحہ ۷۸۔

نظائر خالصاً للہ ممتاز واختر وغیرہم کا کلام ان تینوں طرزوں میں سے کس طرز پر ہے۔ بے شبہ فرماؤگے کہ یہ طرز اور ہی ہے۔ پس تو ہم نے جانا کہ ان کی طرز چوتھی ہے۔ کیا کہنا ہے۔ خوب طرز ہے۔ اچھی طرز ہے مگر فارسی نہیں ہے ہندی ہے۔ دارالضرب شاہی کا سکّہ نہیں ہے۔ ٹکسال باہر ہے داد داد۔ انصاف انصاف [۱]

ایک فارسی غزل

ایک فارسی غزل جو ابھی کہی ہے اسی ورق میں لکھتا ہوں...... غزل کو اپنے احبابِ بزم کے روبرو پڑھیے اور عرض کیجیے کہ ہندوستانی فارسی زبان میں اس طرح کہتا ہے [۲]

بیا کہ قاعدۂ آسماں بگردانیم — قضا بگردشِ رطل گراں بگردانیم
بگوشۂ بنشینیم و در فراز کنیم — بہ کوچہ بر سرِ رہ پاسباں بگردانیم
اگر ز شحنہ بود دار و گیر نندیشم — گر ز شاہ رسد ارمغاں بگردانیم
اگر کلیم شود ہم زباں سخن نہ کنیم — و گر خلیل شود مہماں بگردانیم
گل افگنیم و گلابے بہ رہ گذر پاشیم — می اور یم و قدح درمیاں بگردانیم
ندیم و مطرب و ساقی ز انجمن رانیم — بکار و بار زنی کارداں بگردانیم
گہی بہ لابہ سخن با ادا بیامیزیم — گہی بہ بوسہ زباں در دہاں بگردانیم
نہیم شرم بیک سوی و باہم آویزیم — بشوخیٔ کہ رُخِ اختراں بگردانیم
ز جوشِ سینہ سحر را نفس فرو بندیم — بلائے گرمی روز از جہاں بگردانیم

---

[۱] اردوئے معلیٰ صفحہ ۱۱۶۔ [۲] پنج آہنگ صفحہ ۱۱۶۔

بوہم شب ہمہ را در غلط بیند ازیم
زنیمہ رہ رمہ را باشباں بگردانیم

بجنگ باج ستاناں شاخسارے را
تہی سبد زدر گلستاں بگردانیم

بہ صلح بال فشانان صبحگاہے را
زشاخسار سوئے آشیاں بگردانیم

زحیدریم من و تو زما عجب نبود
گر آفتاب سوئے آشیاں بگردانیم

بمن وصال تو باور نمی کند غالبؔ
بیا کہ قاعدۂ آسماں بگردانیم

ادبی صحبت

قلعہ میں شہزادگانِ تیمور جمع ہو کر کچھ غزلخوانی کر لیتے ہیں...... میں کبھی اس غزل خوانی میں جاتا ہوں کبھی نہیں جاتا اور یہ صحبت خود چند روزہ ہے۔ اس کو دوام کہاں۔ کیا معلوم ہے کہ اب کی نہ ہو اور اب کے ہو تو آئندہ نہ ہو۔

مشاعرہ

جمعہ کی شب کو بزمِ سخن آراستہ ہوئی۔ میں نے طرحی زمین میں غزل نہیں کہی تھی اس لئے مشاعرہ میں جانا نہیں چاہتا تھا لیکن نواب ضیاءالدین احمد خاں نے زین العابدین خاں عارفؔ اور غلام حسن خاں محوؔ کو دو فرشتوں کی طرح مجھ پر مقرر کر دیا۔ وہ دونوں شام کو ہاتھی لیکر میرے مکان پر آئے اور مجھے سوار کرا کے لے گئے۔ وہاں پہونچکر مولانا صدرالدین آزردہؔ کی زیارت سے رنج راہ کی تلافی ہو گئی۔ صہبائیؔ نے طرحی میں غزل پڑھی۔ دو تین شعر دلنشیں تھے۔ عارفؔ اور جوہرؔ نے دو غزلیں پڑھیں۔ میں نے اسی روز ایک غزل کہی تھی جس کا مطلع یہ ہے ؎

صبح شد خیز کہ رو داد اثر بنمائیم
چہرہ آغشتہ بہ خونناب جگر بنمائیم

یہ غزل سُنائی۔ آئندہ مشاعرہ کے لئے "گریبانم نمی آید" و "دامانم نمی آید" طرح ہوئی ہے[۱]

دوسرا مشاعرہ

اُردو کے بہت سے شاعر جمع تھے اور انھوں نے لمبی لمبی غزلیں پڑھیں۔ مفتی صدرالدین آزردہ بیمار تھے اس لئے شریک مشاعرہ نہ ہوئے۔ جب میری باری آئی پہلے میں نے "ملک نخواست" "فلک نخواست" پڑھی۔ پھر غزل طرحی پڑھی ؎

چہ عیش از وعدہ چوں باور زعنوانم نمی آید
بہ نوعے گفتہ می آیم کہ می دانم نمی آید

مشاعرے میں آئندہ کے لئے عرفی کا یہ مصرعہ طرح قرار پایا ع

صد سال می تواں بہ تمنّا گریستن

اس زمین میں طالب آملی نے قصیدہ کہا۔ عرفی نے دو غزلیں۔ اب اس میں غالب بے نوا سے کیا زمزمہ سنجی چاہتے ہیں[۲]

تیسرا مشاعرہ

شام ہوئی تو وہی دو فرشتے یعنی عارف و مجو آکر مجھے لے گئے میر امام الدین ممنون اور مولوی امام بخش صہبائی بہ سبب علالت نہ آئے۔ حضرت آزردہ کی خدمت میں آدمی بھیجا گیا وہ اگرچہ دیر سے آئے مگر تشریف لے آئے۔ میں نے طرحی زمین میں قصیدہ لکھا تھا اور سوچ رہا تھا کہ اس قصیدے کو "برات نامقبول" کی طرح ناخواندہ واپس لیجاؤں اور اردو کے شعرا

---

[۱] کلیات نثر فارسی صفحہ ۲۰۱۔ [۲] کلیات نثر فارسی صفحہ ۲۰۲۔

کو در دسر نہ دوں لیکن حضرت آزردہ کی تشریف لانے سے دل مطمئن ہو گیا اور میں نے قصیدہ پڑھنا ضروری سمجھا۔[۱]

چوتھا مشاعرہ

جمعہ کی شب ۲۵ر فروری کو بادشاہ کا حکم پہونچا کہ سب شاعر قلعہ میں جمع ہوں۔ چنانچہ خاندان بابری کے شہزادے اور دوسرے لوگ اس قدر تعداد میں آئے کہ نشست گاہ میں بیٹھنے کو جگہ نہیں ملتی تھی۔ سب سے پہلے سلطان الشعرا شیخ محمد ابراہیم ذوق نے بادشاہ کی غزل پڑھی۔ پھر شہزادہ خضر سلطان نے اپنی غزل سنائی۔ ان کے بعد میرزا حیدر شکوہ میرزا انور الدین اور میرزا عالی بخت عالی نے اپنا کلام سنایا۔ عالی کے پاس ہی میں بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے اپنی غزل دس شعر کی پڑھی۔ صہبائی کے شاگردوں میں سے محوی نام ایک نوجوان نے "نشید مستانہ" لگائی۔ میرزا حاجی شہرت نے کم و بیش ستر شعر زمین طرحی میں سنائے۔ میں پیشاب کے بہلنے سے وہاں سے اٹھا اور اپنے گھر چلا آیا۔ دوکانوں کے دروازے کھلے تھے۔ چراغ روشن تھے۔ شراب پی اور سو رہا۔ صبح قلعہ میں گیا تو چاروں شہزادے جن کے نام اوپر مرقوم ہیں جمع تھے۔ انھوں نے رات والی غزلیں سنائیں۔ میں نے بھی اپنی غزل دوبارہ پڑھی۔ وہیں سنا کہ مشاعرہ ساری رات جاری رہا۔ سب سے آخر میں سلطان الشعرا نے دو غیر طرحی غزلیں سنائی تھیں۔[۲]

اعتراضات

میں نے سات شعر امیر خسرو کی غزل پر لکھ کر ایک مطرب کو دیئے وہ مجلسوں میں گانے لگا۔ اکبر آباد و لکھنؤ تک مشہور ہوئے۔ وہ غزل

۱؎ کلیات فارسی صفحہ ۳۰۲۔ ۲؎ کلیات فارسی صفحہ ۲۳۸۔

جس کا مطلع یہ ہے ؎

از جسم بجاں نقاب تا کے　　ایں گنج دریں خراب تا کے

ایک صاحب آگرہ میں اور ایک صاحب لکھنؤ میں معترض ہوئے کہ "گنج در خرابہ باید نہ در خراب"۔ ہر چند کہا کہ خرابہ مزید علیہ اور اصل لغت خراب عربی الاصل بمعنی ویراں و ویرانہ ہے جس کی ہندی اُجڑ۔ معترض مصر رہا۔ صایب کے دیوان میں یہ مطلع نکلا ؎

بہ فکرِ دل نہ فتادی بہ ہیچ باب دریغ
بہ گنج راہ نبردی دریں خراب دریغ

غالبؔ سوختہ اختر کا فرہنگ نویسوں کے باب میں عقیدہ کیا ہے

فرہنگ نویس

اگرچہ قاطع برہان میں جا بجا لکھتا ہوں مگر اب ہندی کی چندی کر کے لکھتا ہوں کہ یہ عقیدہ میرا ہے کہ فرہنگ لکھنے والے جتنے ہیں سب ہندی نژاد ہیں۔ ہاں علم صرف و نحو عربی بقدر تحصیل مُسلّم اور اُستاد ہیں[۱]۔ جتنی فرہنگیں اور جتنے فرہنگ طراز ہیں یہ سب کتابیں اور یہ سب جامع مانند پیاز کے چھلکے جس قدر اُتارتے جاؤ گے چھلکوں کا ڈھیر لگ جائے گا۔ مغز نہ پاؤ گے فرہنگ لکھنے والوں کے پردے کھولتے چلے جاؤ لباس ہی لباس دیکھو گے شخص معدوم ہے[۲]

---

[۱] عود ہندی صفحہ ۲۳۳۔ [۲] عود ہندی صفحہ ۲۳۶۔

پندرھواں باب (۱۵)

معیار کلام

اگر اس راز اور پردۂ ساز (یعنی سخنوری) کے سمجھنے کی آرزو ہے تو ریختہ کہنے والوں میں گفتار میر و میرزا اور فارسی شعرا میں صائب۔ عرفی۔ نظیری اور حزیں کا کلام پیش نظر رہے مگر ایسی نظر نہیں کہ آنکھیں تحریر اوراق دیکھیں اور دل کو خبر نہ ہو بلکہ ساری کوشش اس میں صرف ہو کہ جوہر لفظ کو سمجھیں اور فروغ معنی دیکھیں۔ کھرے اور کھوٹے میں تمیز کریں[۱]۔

شعرائے اُردو کی مدح

اگرچہ شاعرانِ نغز گفتار — زیک جام اند در بزم سخن مست
ولے با بادہ بعضے حریفاں — خمارِ چشم ساقی نیز پیوست
مشو منکر کہ در اشعارِ ایں قوم — ورائے شاعری چیزے دگر ہست

وہ چیز دگر پارسیوں کے حصے میں آئی ہے۔ ہاں اردو زبان میں اہل ہند نے وہ چیز پائی ہے۔ میر تقی علیہ الرحمہ سے

میر — بدنام ہو گے جانے بھی دو امتحان کو — رکھیگا کون تم سے عزیز اپنی جان کو
سودا — دکھلایئے لیجا کے تجھے مصر کا بازار — خواہاں نہیں لیکن کوئی واں جنس گراں کا
قائم — قائم اور تجھسے طلب بوسہ کی کیونکر مانوں — ہے تو ناداں مگر اتنا بھی بد آموز نہیں
مومن — تم مرے پاس ہوتے ہو گویا — جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

---

[۱] پنج آہنگ صفحہ ۲۳۲۔

ناسخ کے ہاں کمتر اور آتش کے ہاں بیشتر یہ تیز نشتر ہیں مگر ان کا کوئی شعر اس وقت یاد نہیں آتا۔[1]

ناسخ

شیخ امام بخش طرز جدید کے موجد اور پرانی ناہموار روشوں کے ناسخ تھے۔[2] میرے بھی دوست صادق الوداد تھے مگر یک فنّی تھے۔ صرف غزل کہتے تھے۔ قصیدہ اور مثنوی سے اُن کو کچھ علاقہ نہ تھا۔[3]

سرور کا ایک شعر

رجب علی بیگ سرور نے جو "فسانہ عجائب" لکھا ہے۔ آغاز داستان کا شعر اب مجھ کو بہت مزا دیتا ہے ؎

یادگارِ زمانہ ہیں ہم لوگ — یاد رکھنا فسانہ ہیں ہم لوگ

مصرع ثانی کتنا گرم ہے اور "یاد رکھنا" اور "فسانے" کے واسطے کتنا مناسب۔[4]

اسد کا مطلع

ایک شخص نے مطلع میرے سامنے پڑھا اور کہا "قبلہ! آپ نے کیا خوب مطلع کہا ہے۔" ؎

اسد اس جفا پر بتوں سے وفا کی — مرے شیر شاباش رحمت خدا کی

میں نے سن کر عرض کیا کہ "صاحب! جس بزرگ کا یہ مطلع ہے اس پر بقول اس کے رحمت خدا کی اور اگر میرا ہو تو مجھ پر لعنت۔ اسد اور شیر اور بت اور جفا اور وفا میری طرزِ گفتار نہیں ہے۔[5] بات یہ ہے کہ ایک شخص میر امانی اسد ہو گذرے ہیں۔ یہ مطلع یہ غزل اُن کے کلام معجز نظام میں سے ہے اور تذکروں

---

[1] اُردوئے معلیٰ صفحہ ۱۱۶۔ [2] اُردوئے معلیٰ صفحہ ۲۰۲۔ [3] اُردوئے معلیٰ صفحہ ۲۲۳۔
[4] اُردوئے معلیٰ صفحہ ۸۰۔ [5] اُردوئے معلیٰ صفحہ ۳۰۳۔

میں مرقوم ہے۔

غالب تخلص

میں نے کوئی دو چار برس ابتدا میں اسد تخلص رکھا ہے ورنہ غالب ہی لکھتا رہا ہوں[1]۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ اور کی غزل میرے نام پر لوگ پڑھ دیتے ہیں[2]۔

کلکتہ میں ایک قطعہ

وہ جو (فعلاتن فعلاتن فعلن) یہ بحر ہے۔ اس میں میرا ایک قطعہ ہے کہ وہ میں نے کلکتہ میں کہا تھا۔ تقریب یہ کہ مولوی کرم حسین صاحب میرے ایک دوست تھے انھوں نے ایک مجلس میں ایک چکنی ڈلی بہت پاکیزہ اور بے ریشہ کف دست پر رکھ کر مجھ سے کہا کہ اس کی کچھ تشبیہات نظم کیجیے۔ میں نے وہاں بیٹھے بیٹھے نو دس شعر کا قطعہ لکھ کر ان کو دیا اور صلہ میں وہ ڈلی اُن سے لے لی۔ اب سوچ رہا ہوں کہ جو شعر یاد آتے جاتے ہیں لکھتا جاتا ہوں[3]۔ قطعہ

ہے جو صاحب کے کفِ دست پہ یہ چکنی ڈلی
زیب دیتا ہے اسے جس قدر اچھا کہیے
خامہ انگشت بدنداں کہ اسے کیا کہیے
ناطقہ سر بہ گریباں کہ اِسے کیا کہیے
اخترِ سوختۂ قیس سے نسبت دیجے
خالِ مشکینِ رُخِ دلکش لیلےٰ کہیے

---

[1] اُردوئے معلیٰ۔ [2] اُردوئے معلیٰ صفحہ ۱۷۱۔ [3] اُردوئے معلیٰ صفحہ ۲۲۲۔

حجر الاسودِ دیوار حرم کیجیے فرض
نافہ آہوئے بیابانِ ختن کا کہئے
صومعہ میں اسے ٹھہرایئے گر مہرِ نماز
میکدے میں اسے خشتِ خُمِ صہبا کہئے
مسی آلودہ سر انگشتِ حسیناں کہئے
سرِ پستانِ پریزادسے مانا کہئے
غرضکہ بیس بائیس پھبتیاں ہیں۔ اشعار سب کب یاد رہتے ہیں اخیر کی بیت یہ ہے۔ بیت

اپنے حضرت کے کفِ دست کو دل کیجیے فرض
اور اس چکنی سُپاری کو سویدا کہئے

کلکتہ کا ارمغاں

حضرت! وہ شعر بنگالی زبان کا ہو ۱۸۲۹ء میں ضیافت طبع احباب کے واسطے کلکتہ سے ارمغان لایا ہوں۔ صحیح یوں ہے

تم کہے تھے رات میں آئیں گے سو آئے نہیں
قبلہ بندہ رات بھر اس غم سے کچھ کھائے نہیں

فن تاریخ سے نفرت

فن تاریخ کو دونِ مرتبہ شاعری جانتا ہوں اور (مرزا تفتہ) کی طرح سے یہ بھی میرا عقیدہ نہیں ہے کہ تاریخ وفات لکھنے سے ادائے حق محبت ہوتا ہے[۱]۔ اس کو سب جانتے ہیں کہ میں مادہ تاریخ نکلنے میں عاجز ہوں۔ لوگوں کے مادّے دیئے ہوئے نظم کر دیتا ہوں

---

[۱] اردوئے معلیٰ صفحہ ۸۸۔

اور جو مادّہ اپنی طبیعت سے پیدا کرتا ہوں وہ بیشتر لچر ہوا کرتا ہے[۱]

ایک اردو غزل

وکیل حاضر باش دربار اسد اللہی یعنی علائی مولائی نے اپنے موکل کی خوشنودی کے واسطے فقیر کی گردن پہ سوار ہو کر ایک اردو غزل لکھوائی۔ اگر پسند آئے مطرب کو سکھائی جائے۔ جھنجھوٹی کے اونچے سروں میں راہ رکھوائی جائے۔

موسیقی سے لگاؤ

غزل

میں ہوں مشتاق جفا مجھ پہ جفا اور سہی
تم ہو بیداد سے خوش اس سے سوا اور سہی

غیر کی مرگ کا غم کس لئے اے غیرتِ ماہ
ہیں ہوس پیشہ بہت وہ نہ ہوا اور سہی

تم ہو بُت پھر تمہیں پندارِ خدائی کیوں ہے
تم خداوند ہی کہلاؤ خدا اور سہی

حُسن میں حور سے بڑھکر کبھی ہونیکے نہیں
آپ کا شیوہ و انداز و ادا اور سہی

تیرے کوچہ کا ہے مائل دلِ مضطر میرا
کعبہ ایک اور سہی قبلہ نما اور سہی

کوئی دنیا میں مگر باغ نہیں ہے واعظ
خلد بھی باغ ہے خیر آب و ہوا اور سہی

---

۱ اردوئے معلیٰ صفحہ ۳۵۴۔

کیوں نہ فردوس میں دوزخ بھی ملالیں یارب
سیر کے واسطے تھوڑی سی فضا اور سہی

مجھ کو وہ دو کہ جسے کھا کے نہ پانی مانگوں
زہر کچھ اور سہی آب بقا اور سہی

مجھ سے غالب یہ علائی نے غزل لکھوائی
ایک بیداد گر رنج فزا اور سہی

اصلاحِ شعر بریلی اور لکھنؤ اور کلکتہ اور بمبئی اور سورت سے اکثر حضرات نظم و نثر فارسی اور ہندی بھیجتے رہتے ہیں۔ میں خدمت بجالاتا ہوں اور صاحب میرے حک و اصلاح کو مانتے ہیں۔ کلام کا حسن و قبح میری نظر میں رہتا ہے اور ہر ایک کا پایہ اور دستگاہ

طرزِ اصلاح فن شعر میں معلوم ہو جاتا ہے۔[۱] فقیر کا شیوہ خوشامد نہیں۔ فن شعر میں اگر اس شیوہ کی رعایت کی جاوے تو شاگرد ناقص رہ جاتا ہے[۲] فقیر کا قاعدہ یہ ہے کہ اگر کلام میں اغلاط و اسقام دیکھتا ہوں تو رفع کر دیتا ہوں اور اگر سقم سے خالی پاتا ہوں تو تصرف نہیں کرتا۔[۳] جہاں لفظ کے بدلے لفظ لکھتا ہوں اس کی وجہ خاطر نشان کر دیتا ہوں تاکہ آئندہ صاحب کلام اس قسم کے کلام میں خود اپنے کلام کا مصلح رہے۔[۴]

---

[۱] اردوئے معلی صفحہ ۲۳۵۔ [۲] اردوئے معلی صفحہ ۱۹۔ [۳] اردوئے معلی صفحہ ۱۷۲۔ [۴] عود ہندی صفحہ ۲۵۳۔

تعلیم و تلقین

کلام ہمارا اپنے نفس میں معقول و استوار جو زباں داں ہو گا وہ سمجھ لے گا۔ غلط فہم و کج اندیش لوگ نہ سمجھیں نہ سمجھیں۔ ہم کو خلق کی تہذیب و تلقین سے کیا علاقہ۔ تعلیم و تلقین واسطے دوستوں اور یاروں کے ہے نہ واسطے اغیار کے۔[1]

شعر کے لئے کیا چاہیئے؟

صناعت شعر اعضا و جوارح کا کام نہیں۔ دل چاہیئے دماغ چاہیئے۔ ذوق چاہیئے۔ اُمنگ چاہیئے۔ یہ سامان کہاں سے لاؤں جو شعر کہوں۔ چونسٹھ برس کی عمر، ولولۂ شباب کہاں رعایت فن اس کے اسباب کہاں۔ اِنّا لِلّٰہِ وَ اِنّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔[2]

۱؎ اُردوئے معلیٰ صفحہ ۵۰۔ ۲؎ اردوئے معلیٰ صفحہ ۱۰۷۔

سولھواں باب (۱۶)

عہدِ ضعیفی میں
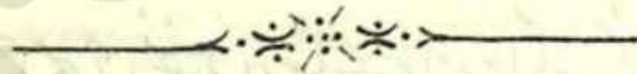
میں شاعر سخن سنج اب نہیں رہا صرف سخن فہم رہ گیا ہوں۔ بڈھے پہلوان کی طرح پیچ بتانے کی گوں ہوں...... شعر کہنا مجھ سے بالکل چھوٹ گیا۔ اپنا اگلا کلام دیکھ کر حیران رہ جاتا ہوں کہ میں نے کیونکر کہا تھا[1]۔ میرا حال اس فن میں اب یہ ہے کہ شعر کہنے کی روش اور اگلے کہے ہوئے اشعار سب بھول گئے مگر ہاں اپنے ہندی کلام میں سے ڈیڑھ شعر یعنی ایک مقطع اور ایک مصرع یاد رہ گیا ہے۔ سو گاہ گاہ جب دل الٹنے لگتا ہے تب دس پانچ بار یہ مقطع زبان پہ آجاتا ہے ؎

زندگی اپنی جب اس شکل سے گذری غالبؔ
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

پھر جب سخت گھبراتا ہوں اور تنگ آتا ہوں تو یہ مصرع پڑھ کر چپ ہو جاتا ہوں[2]۔ ع اے مرگ ناگہاں تجھے کیا انتظار ہے

یادِ گزشتگان

نظام الدین ممنونؔ کہاں۔ ذوقؔ کہاں۔ مومن خاں کہاں۔ ایک آزردہ سو خاموش دوسرا غالبؔ وہ بیخود و مدہوش۔ نہ سخنوری رہی نہ سخندانی۔ کس برتے پہ تتا پانی۔ ہائے دلی۔ وائے دلی۔ بھاڑ میں جائے دلی[3]۔

---

[1] اردوئے معلی صفحہ ۳۴۔ [2] اردوئے معلی صفحہ ۹۶۔ [3] اردوئے معلی صفحہ ۱۳۴۔

عشق نے غالبؔ نکما کر دیا   ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

بوڑھا پہلوان

۶۵ برس کی عمر ہوئی - اضمحلال قوئ ضعف دماغ - فکر مرگ - غم عقبیٰ ..... نظم و نثر کا کام ۵۰ برس کی مشق کے زور سے چلتا ہے ورنہ جوہر فکر کی درخشندگی کہاں - بوڑھا پہلوان پیچ بتاتا ہے زور نہیں دلوا سکتا [1]

ناکامی

اب نہ فارسی کی فکر نہ اردو کا ذکر نہ دنیا میں توقع نہ عقبیٰ کی امید - ہیں ہوں اور اندوہِ ناکامیٔ جاوید جیسا کہ خود ایک قصیدہ نعت کی تشبیب میں کہتا ہوں [2] شعر

چشم کشودہ اند بہ کردار ہائے من   نا ایندہ نا امیدم و از رفتہ شرمسار

شعر گوئی متروک

عاشقانہ اشعار سے مجھ کو وہ بُعد ہے جو ایمان سے کفر کو - گورنمنٹ کا بھاٹ تھا بھٹی کرتا تھا خلعت پاتا تھا - خلعت موقوف - بھٹی متروک - نہ غزل نہ مدح - ہزل و ہجو میرا آئین نہیں - پھر کہو کیا لکھوں [3]

نظم و نثر کی ناقدری

ہر شخص نے بقدر حال ایک ایک قدرداں پایا - غالبؔ سوختہ اختر کی نثر کی داد نہ ملی [4]

کسم نخوت نہ پذیرفت و دیر بارم برد   چہ نامہ آنکہ بود نا نوشتہ عنوانش

اگرچہ ایک فقہ ہوں مگر مجھے ایمان کی قسم میں نے اپنی نظم و نثر کی داد باندازہ بایست پائی نہیں - آپ ہی کہا آپ ہی سمجھا قلندری و آزادگی و ایثار و کرم کے جو دواعی میرے خالق نے مجھ میں بھر دیئے ہیں بقدر ہزار ایک ظہور میں نہ آئے نہ وہ طاقت جسمانی کہ ایک لاٹھی ہاتھ میں لوں اور اس میں شطرنجی اور ٹین کا لوٹا

---

[1] اردوئے معلیٰ صفحہ ۱۹۶ - [2] اردوئے معلیٰ صفحہ ۱۶۵ - [3] اردوئے معلیٰ صفحہ ۳۵۵ - [4] اردوئے معلیٰ صفحہ ۳۰

مع سوت کی رسی کے لٹکالوں اور پیادہ پا چلدوں۔ کبھی شیراز جا نکلا۔ کبھی مصر میں جا ٹھہرا کبھی نجف جا پہونچا۔ نہ وہ دستگاہ کہ ایک عالم کا میزبان بن جاؤں۔ اگر تمام عالم میں نہ ہو سکے نہ سہی جس شہر میں رہوں اس شہر میں تو بھوکا ننگا نظر نہ آوں نظم

نہ بستاں سرائے نہ میخانہ ۔۔۔ نہ دستاں سرائے نہ جانانہ

نہ رقص پری پیکراں بر بساط ۔۔۔ نہ غوغائے رامشگراں در رباط

خدا کا مقہور۔ خلق کا مردود۔ بوڑھا ناتوان بیمار۔ فقیر۔ نکبت میں گرفتار[1]

داد نہ پائی

ایک کم ستّر برس دُنیا میں رہا اب کہانتک رہوں گا۔ ایک اردو کا دیوان ہزار بارہ سو بیت کا۔ ایک فارسی کا دیوان دس ہزار کئی سو بیت کا۔ تین رسالے نثر کے پانچ نسخے مرتّب ہو گئے۔ اب اور کیا کہوں گا۔ مدح کا صلہ نہ غزل کی داد پائی۔ ہرزہ گوئی میں ساری عمر گنوائی بقول طالب آملی علیہ الرحمۃ[2]

لب از گفتن چناں بستم کہ گوئی ۔۔۔ دہن بر چہرہ زخمے بود بہ شد

دل و دماغ کی کمزوری

قوت باقی نہیں رہی۔ کبھی جو سابق اپنی نظم و نثر دیکھتا ہوں تو یہ جانتا ہوں کہ یہ تحریر میری ہے مگر حیران ہوں کہ میں نے یہ نثر کیونکہ لکھی تھی اور کیونکہ یہ شعر کہے تھے۔ عبدالقادر بیدل کا یہ مصرع میری زباں سے ہے[3] ع

عالم ہمہ افسانۂ ما دارد و ما ہیچ

پایانِ عمر ہے۔ دل و دماغ جواب دے چکے ہیں۔

غزل و قصیدہ ترک

اموات میں ہوں مُردہ شعر کیا کہے گا۔ غزل کا ڈھنگ بھول گیا معشوق کس کو قرار دوں جو غزل کی روشن ضمیر میں نہ آوے۔

---

[1] اُردوئے معلی صفحہ ۳۲۳۔ [2] اُردوئے معلی صفحہ ۱۶۵۔ [3] اُردوئے معلی صفحہ ۱۱۲۔

رہا قصیدہ ممدوح کون ہے۔ ہائے انوریؔ گویا میری زبان سے کہتا ہے[1]

اے دریغا نیست ممدوح سزاوار مدیح　　　اے دریغا نیست معشوقے سزاوار غزل

ممدوحین

میرا ممدوح جیتا نہیں نصیر الدین حیدر اور امجد علی شاہ ایک ایک قصیدہ میں چلدیئے۔ واجد علی شاہ تین قصیدوں کے متحمل ہوئے پھر نہ سنبھل سکے جس کی مدح میں دس بیس قصیدے کہے گئے وہ عدم سے بھی پرے پہنچا[2]۔

طبیعت کی پژمردگی

سچ تو یوں ہے کہ قوتِ ناطقہ پر وہ تصرف اور قلم میں وہ زور نہ رہا طبیعت میں وہ مزا مستی وہ شور نہ رہا۔ پچاس پچپن برس کی مشق کا ملکہ کچھ باقی رہ گیا ہے۔ اسی سبب سے فن کلام میں گفتگو کرلیتا ہوں حواس کا بھی بقیہ اسی قدر رہ ہے کہ معرض گفتار میں موافق سوال جواب دیتا ہوں۔ روز و شب یہ فکر رہتی ہے کہ دیکھیئے وہاں کیا پیش آتا ہے اور یہ بال بال گنہگار کیونکر بخشا جاتا ہے[3]۔

پیشینگوئی

میں اب انتہائے عمرنا پائدار کو پہونچکر آفتاب لب بام اور ہجوم امراض جسمانی و آلام روحانی سے زندہ درگور ہوں۔ کچھ یاد خدا بھی چاہیئے۔ نظم و نثر کے قلمرو کا انتظام ایزد دانا و توانا کی عنایت و اعانت سے خوب ہوچکا۔ اگر اس نے چاہا تو قیامت تک میرا نام و نشان باقی و قائم رہے گا[4]

کو کبم را در عدم اوجِ قبولی بودہ است
شہرتِ شعرم بہ گیتی بعد من خواہد شدن

---

[1] اردوئے معلی صفحہ ۱۰۷۔ [2] اردوئے معلی صفحہ ۱۴۳۔ [3] اردوئے معلی صفحہ ۱۶۵۔ [4] اردوئے معلی صفحہ ۸۷۔

بقولِ غالبؔ

۱ دوست کی دوستی سے کام اس کے افعال سے کیا غرض[1]

۲ اچھوں کا شیوہ ہے بُروں کو اچھا کہنا[2]

۳ جس شخص کو جس شغل کا ذوق ہو اور وہ اس میں بے تکلف عمر بسر کرے اس کا نام عیش ہے[3]

۴ بزرگوں کا مرنا بنی آدم کی میراث ہے[4]

۵ کسی کے مرنے کا وہ غم کرے جو آپ نہ مرے[5]

۶ شکوے کی خوبی یہ ہے کہ راہِ راست سے مُنہ نہ موڑے اور معہذا دوسرے کے واسطے جواب گنجائش نہ چھوڑے[6]

۷ حُسن بھی کیا چیز ہے۔ قادر کا اتنا خوف نہیں حسین آدمی کا ڈر ہوتا ہے[7]

۸ خود غلطی پر نہ ہو اور غیر کی غلطی سے کام نہ رکھو[8]

۹ بیگانہ وار دیکھو اور از روئے انصاف[9]

---

[1] اُردوئے معلیٰ صفحہ ۸۰۔ [2] عودِ ہندی صفحہ ۲۷۶۔ [3] اُردوئے معلیٰ صفحہ ۱۵۵۔ [4] اُردوئے معلیٰ صفحہ ۲۷۶۔ [5] اردوئے معلیٰ صفحہ ۳۰۹۔ [6] اردوئے معلیٰ صفحہ ۲۱۷۔ [7] اُردوئے معلےٰ صفحہ ۱۴۲۔ [8] اُردوئے معلیٰ صفحہ ۵۸ [9] اردوئے معلیٰ صفحہ ۴۳۶۔

۱۰ شعر کا کام دل و دماغ کا ہے[1]

۱۱ جو کچھ لکھو اس کو دو بارہ سہ بارہ دیکھا کرو[2]

۱۲ غالب کہتا ہے کہ اساتذہ کے کلام کے مشاہدہ میں اگر تو غل رہے تو ہزار ہا بات نئی معلوم ہوتی ہے[3]

---

[1] اردوئے معلیٰ صفحہ ۸۶۔ [2] اردوئے معلیٰ صفحہ ۴۴۔ [3] عود ہندی صفحہ ۲۱۲۔
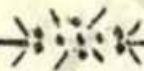
باہتمام منشی عبدالعزیز خاں مینجر

عزیزی پریس آگرہ میں طبع ہوئی

۱۹۴۲ء